ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ
سعید احمد اکبرآبادی

ندوۃ المصنفین کی دینی اور اجتماعی کتابیں

اسلام کا اقتصادی نظام

وقت کی ایک انقلاب انگیز کتاب، جس میں اسلام کے معاشی نظام کا جامع نقشہ پیش کیا گیا ہے، چوتھا ایڈیشن جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے ہیں۔
قیمت ۵ر، مجلد ۶ر

اسلام کا نظامِ مساجد

نظامِ مساجد کے تمام گوشوں پر دل پذیر بحث اور اس کی منفعتوں اور برکتوں کی تفصیل۔
قیمت ۴ر مجلد للعہ

اسلام کا نظامِ عفّت و عصمت

عفت و عصمت اور اُن کے لوازم پر بصیرت افروز بحث اور نظامِ عفت کی اسلامی خصوصیتوں کی دل پذیر تشریح، لائق مطالعہ کتاب، قیمت للعہ مجلد ۵ر۔

اسلام کا زرعی نظام

اسلام کے نظامِ زراعت پر ایک جامع کتاب، زمین کی تقسیم کے اصول اور خلافت راشدہ کے زمانے میں کاشتکاروں کے لئے جو سہولتیں فراہم کی گئی ہیں ان کی تفصیل
قیمت للعہ مجلد ۵ر

اِسلام میں غلامی کی حقیقت

مسئلہ غلامی کی تحقیق پر معرکۃ الآرا کتاب جس میں انفرادی اور اجتماعی غلامی کے ایک ایک پہلو پر اسلام کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔
(قیمت ۳ر مجلد للعہ)

قرآن اور تعمیرِ سیرت

ایک عظیم الشان اصلاحی کتاب

قرآن مجید کی تعلیم و تربیت کا انسانی سیرت کی تعمیر میں کیا دخل ہے اور اس کے ذریعہ سے اس سیرت و کردار کا کس طرح ظہور ہوتا ہے؟ یہ متبرک کتاب خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔
قیمت ۵ر مجلد ۳ر

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق

علم الاخلاق پر مبسوط اور محققانہ کتاب، جس میں اصول اخلاق، فلسفہ اخلاق اور انواع اخلاق کی دل پذیر تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ جس سے اسلام کے مجموعہ اخلاق کی برتری دوسری ملتوں پر ثابت ہوتا ہے۔ نظر ثانی کیا ہوا تازہ ایڈیشن۔
قیمت ۶ر مجلد ۶عہ

ارشاداتِ نبوی کا لاثانی ذخیرہ

اردو زبان میں

ترجمان السنہ:۔ ہماری زبان میں ایسی جامع اور مستند کتاب آج تک وجود میں نہیں آئی تھی، اس میں حدیثوں کا عربی متن مع اعراب بھی ہے اور صاف و سلیس ترجمہ بھی، ساتھ ہی تشریحی اور تحقیقی نوٹ بھی ہیں۔ ترتیب میں کتاب التوحید کو پہلے رکھا گیا ہے اور پھر اسی مناسبت سے پوری کتاب کی ترتیب قائم کی گئی ہے، پہلی جلد کے شروع میں کئی سو صفحات کا ایک بصیرت افروز مقدمہ ہے۔
جلد اول قیمت عہ مجلد عہ جلد دوم قیمت لہ مجلد لہ عہ

فہم قرآن قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنیٰ ہیں، کلام ربانی کا قطعی منشا معلوم کرنے کے لئے آنحضرت کے ارشادات و اقوال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے؟ اس موضوع پر ایک بہترین تبلیغی اور اصلاحی کتاب ہے۔
قیمت ۱عہ مجلد ۱ہ

وحی الٰہی مسئلہ وحی کے تمام گوشوں کی دل پذیر تشریح، وحی کی حقیقت اور اس کی صداقت سمجھنے کے لئے لاجواب کتاب، نہایت نفیس۔ جدید ایڈیشن۔
قیمت ۳ر مجلد للعہ

مینیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

بُرہان

جلد ۳۸ شمارہ ۲

فروری ۱۹۵۷ء مطابق رجب المرجب ۱۳۷۶ھ

فہرست مضامین

نظرات	سعید احمد	۶۶
مسئلہ تملیک فی الزکوٰۃ	جناب مرزا محمد یوسف صاحب استاذ عربی گورنمنٹ مدرسہ عالیہ ورنیٹیل کالج رام پور	۶۹
محمود غزنوی پر ایک سرسری نظر	جناب قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت ایم اے	۸۳
سورۂ بقرہ کی ایک آیت کی صحیح تاویل	جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی	۱۰۰
مفتاح الصلوٰۃ	جناب پروفیسر شیخ فرید صاحب برہان ایم اے لکچرار رابرٹسن کالج جبل پور	۱۰۸
جامعہ ازہر	جناب مجیب الرحمٰن صاحب عثمانی بی اے جامعہ نگر دہلی	۱۱۵
ادبیات		
غزل	جناب آثم مظفر نگری	۱۲۵
غزل	جناب شمس نوید	
گزارشِ مجبور	جناب فضا ابنِ فیضی	
تبصرے	(س)	۱۲۸

ہوتا ہیں

اس سلسلہ میں آئسٹائن اور وہائٹ ہیڈ کے نام خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں جن میں سے اول الذکر نے مادہ کا تصور ہی ختم کر دیا اور موخر الذکر نے ریاضی کے اصول سے خدا کے وجود اور اُس کی صفات کا اثبات کیا اور غالباً سائنس کی اسی پیدا کی ہوئی عام فضا کا اثر ہے کہ پچھلے دنوں روس کی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر خرشچیف بھی تقریر کرتے کرتے بے ساختہ خدا کا نام لے پڑے اور ان کے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھ گئے

علاوہ بریں غور کرو جمہوریت ۔ مساواتِ انسانی ۔ شرف و مجدِ بنی آدم ۔ عالمی شہریت ۔ معیشتِ باہمی ۔ وحدتِ ادیان ۔ یہ سب جو آج کی دنیا کے سب سے زیادہ محبوب نعرے ہیں ۔ کس کی صدائے بازگشت ہیں ؟ ان تمام افکار کا اصل منبع اور سرچشمہ کہاں ہے ؟ نہ ہی وادیٔ بطحا جس کی ارضِ پاک پر آخری کتابِ الٰہی کا نزول ہوا یا کوئی اور ؟ اگر یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے اور جوشِ عقیدت کا شاعرانہ پیرایۂ اظہار نہیں تو باور کرنا چاہیئے کہ آج دنیا علمی اور فکری و نظری اعتبار سے اسلام سے جتنی قریب آگئی ہے اتنی کبھی نہیں آئی تھی ۔ فکر و نظر کی گمراہی اور عقل و دانش کی غلط اندیشیوں کا وہ کون سا تلخ تجربہ ہے جو دنیا نے نہیں کر لیا ۔ اور جس کے تباہ کن نتائج خود اُس نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ لئے ۔ آج یہ کیا ہے کہ وہی یورپ اور امریکہ جو خدا ناشناسی کے لئے مشہور تھے ۔ وہاں گراہام بیلی کی دعوتِ خدا شناسی پر لاکھوں انسان سر جھکتے ہیں اور رو رو کر پھر خدا کی طرف لوٹ جانے کا عہد و پیمان کرتے ہیں اور وہ اپنی ایک ایک تقریر سے ہزاروں مردوں اور عورتوں کو بیک وقت بپتسمہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے یہ سب اس بات کی علامت ہے کہ انسانیت کا مردہ ضمیر پھر بیدار ہو رہا ہے ۔ اور اُس کی اخلاقی حس کی رگوں میں زندگی کا پھر تازہ خون پیدا ہو رہا ہے ۔

ان حالات

میں سوچنا اور غور کرنا چاہیئے کہ خود دینِ حق اور مذہبِ قیم کے علم برداروں کا کیا فرض ہے اور اُس فرض کو کس طرح ادا کیا جا سکتا ہے ؟

مسئلہ تملیک فی الزکوٰۃ

از

جناب مرزا محمد یوسف صاحب

اُستاذ عربی مدرسہ عالیہ رام پور (یوپی)

دلائل کی تنقیح

(۶)

(viii) کسی مردہ غریب کا قرضہ صدقۂ زکوٰۃ سے ادا کرنا اس سے زیادہ بے انصافی کا مقتضی ہے۔ اس لئے کہ اس مسئلے کی دو جہتیں ہیں۔

مواخذۂ اخروی کا اندیشہ:۔ اس کے لئے بجائے اس کے کہ فقراء و مساکین کا پیٹ کاٹا جائے یا تو قرض خواہ جو عموماً طبقۂ اغنیاء سے تعلق رکھتے ہیں اس غریب مردہ کو آخرت میں مقروض رکھنے کے بجائے اس دنیا میں معاف کر دیں یا اگر وہ لوگ معاف نہ کریں تو اہلِ خیر مسلمان اس قرضہ کو ادا کر دیں۔

سماج کی معاشی تنظیم:۔ سماج کی صالح تنظیم کے لئے ضروری ہے کہ قرض داروں سے قرض خواہوں کے قرضے چکوانے کا مؤثر انتظام ہو۔ اب غور کیجئے ما نحن فیہ میں کیا ہوگا قرضہ فقراء کے حصے میں چکوایا جائے گا لہٰذا فقراء کا تو پیٹ کٹا اور فائدہ ہوا اغنیاء کا کہ اُن کی ڈوبی ہوئی رقم وصول ہوگئی (اس لئے کہ قرض خواہ عموماً طبقۂ اغنیاء ہی سے تعلق رکھتے ہیں)

لہٰذا اس مسئلہ میں بھی اہلِ انصاف ہی انصاف کریں گے کہ اگر فقہاء نے یہ فتویٰ دیا کہ صدقۂ زکوٰۃ سے مردہ کا قرضہ ادا نہیں کیا جا سکتا تو انھوں نے حق و انصاف اور اسلام کی روح کو ملحوظ رکھا یا نہیں مگر جب مزاج سرمایہ داری عہد کی انفرادیت (Individualism) سے معتاد ہو جاتے

ہیں تو پھر اسلام کی انصاف کوشی اور انسان دوستی کو مشکل ہی سے درک کرپاتے ہیں۔

(۱۱×) صدقۂ زکوٰۃ سے غلام خرید کر آزاد کرنا سو اس زمانہ میں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب اس بحث کی ایک جدلی قیمت رہ گئی ہے۔

زکوٰۃ معاشرۂ اسلامی کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہے مگر اسلامی نقطۂ نظر سے یہ اس کی ثانوی حیثیت ہے اولاً یہ ایک خالص تعبدی امر ہے اور اللہ تعالیٰ یہ آزمانا چاہتا ہے کہ اُس کے بندے اُس کے حکم کی تعمیل میں مال جیسی پیاری چیز سے کہاں تک دست بردار ہو سکتے ہیں۔ یہ اُن کے تیاگ کا امتحان ہے۔

لہٰذا اگر آدمی کسی نفع عاجل کی خاطر اپنی دولت کو صرف کرے تو یہ تجارت ہے "تیاگ" نہیں ہے، تیاگ وہ ہے جس میں کسی نفع یقینی یا نفع موہوم کی امید نہ ہو اور یہی چیز زکوٰۃ میں ملحوظ ہے۔ جس زمانہ میں غلام خریدے اور آزاد کئے جاتے تھے یہ رسم معروف تھی کہ آزاد کنندہ کو غلام کی وِلا حاصل ہو جایا کرتی تھی یعنی اگر غلام لاوارث مرے تو اُس کا ترکہ اُس کے آزاد کرنے والے کو ملے گا۔ اب اگر رقم زکوٰۃ سے غلام آزاد کیا جائے تو اس میں اُس کی ولا زکوٰۃ دہندہ کو حاصل ہوگی یعنی ایک نفع کی اس میں توقع ہے تو پھر یہ تجارت ہوئی "تیاگ" تو نہ ہوا جو امور تعبدی کی جان ہے۔

یہ ہے روحِ اسلام کا تقاضا جس کی بناء پر فقہاء سابقین نے فتویٰ دیا کہ رقم زکوٰۃ سے بردے آزاد نہیں کئے جا سکتے۔ ضمناً تملیک کے اصول کی بھی مراعاۃ ہو گئی۔

(×) وصولی زکوٰۃ کے مصارف پر رقوم زکوٰۃ کا خرچ ہونا:۔ عاملین علی الزکوٰۃ کے سہم سے جو انکار کرے وہ کافر۔ مگر عامل اور فضولی میں فرق ہے۔ عامل کو جو فقراء کو تحصیلِ زکوٰۃ سے فارغ کر دیتا ہے دو وجہ سے معاوضہ ملتا ہے:

اولاً:۔ اُس نے فقراء کو جسمانی طور پر تحصیلِ زکوٰۃ کی کلفت سے فارغ کر دیا۔

ثانیاً:۔ ذہنی طور پر اُس نے فقراء کو فارغ البال کر دیا اور اطمینان دلا دیا کہ رقومِ زکوٰۃ اُن تک ضرور پہنچ جائیں گی۔

فضولی پہلی شرط کو پورا کرتا ہے دوسری کو نہیں[۱] لہٰذا معاوضہ کا مستحق کیوں ہو؟ اور ہر دو ہیچ کا پچو لیا

---

[۱] کیوں کہ اگر وہ رقوم زکوٰۃ میں تغلب بیجا یا خیانت مجرمانہ کرے تو اسے ایسا کرنے سے باز رکھنے کی کیا ضمانت ہے۔

جسے امام نے اس کام کے لئے مقرر نہ کیا ہو وہ بطور خود اس کام کو اپنے ذمے لے لے وہ فضولی ہے خواہ وہ شخصِ واحد ہو یا کوئی انجمن و ادارہ ہو الا یہ کہ اُس انجمن یا ادارے نے حکومت کی طرف سے یہ حق حاصل کر لیا ہو۔ اس صورت میں اس انجمن یا ادارے کے متعلق تغلبِ بیجا یا خیانتِ مجرمانہ کا اندیشہ نہیں کیا جا سکتا لہٰذا وہ معاوضہ کا مستحق ہو سکتا ہے۔

غرض نیکی اور خدمتِ خلق کے جن کاموں کی فہرست اصلاحی صاحب نے گنائی ہے اُن میں (بالخصوص پہلے چھے میں) اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ سو فی صدی غریبوں کے مفاد سے متعلق ہیں، ناممکن ہے کہ غیر غربا حتیٰ کہ زکوٰۃ دہندہ بھی اُس سے شعوری یا غیر شعوری طور پر مستفید نہ ہوں۔ اور اگر ایسا ہوا ——— جو ہونا یقینی ہے ——— تو پھر آیت میں جو قصر و حصر ہے اُس کا کیا فائدہ رہا۔ انما کا عمل ذوقِ اجتہاد کی خاطر لغو ہو جائے گا اور پھر اس صورت میں اولاً تو آیت کی بلاغت اور مقتضائے کلام کو بالکل ذبح کر دینا پڑے گا اور ثانیاً انما کا عمل لغو ہونے کے بعد "ومنھم من یلمزك فی الصدقات" اور "انما الصدقات للفقراء" میں کیا ربط رہ جائے گا۔

پھر نیکی اور خدمت خلق کے جن کاموں کی فہرست اصلاحی صاحب نے گنائی ہے وہ سب غریبوں کے مفاد سے متعلق ہے حالاں کہ قرآن و حدیث سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ صدقات زکوٰۃ صرف فقرا کا حق ہیں اور قرآن کے مصطلحہ فقرا اور اردو کے غربا میں زمین آسمان کا فرق ہے نیز مصارف زکوٰۃ کو قرآن نے کھول کر بیان کر دیا ہے۔ اب اس میں اضافہ کا کسی کو حق نہیں ہے اور تو اور خود پیغمبر اسلام کو بھی اس میں دخیل نہ ہونے کا اعتراف تھا۔ چنانچہ حدیث مشہور ہے جسے امام ابو جعفر الطحاوی نے شرح معانی الآثار میں روایت کیا ہے۔

"حدثنا یونس قال حدثنا ابن وھب قال اخبرنی عبد الرحمٰن بن زیاد بن انعم عن زیاد ابن نعیم انه سمع زیاد بن الحارث الصدائی یقول:۔
امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی قومی فقلت یا رسول اللہ اعطنی من صدقاتھم ففعل وکتب لی بذالك کتابا فاتاہ رجل، فقال یا رسول اللہ

اعطنی من الصدقۃ، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ عزوجل لم یرض بحکم نبی ولا غیرہ فی الصدقات حتی حکم فیھا ھو من السماء فجزأھا ثمانیۃ اجزاء فان کنت من تلک الاجزاء اعطیتک"

(طحاوی: شرح معانی الآثار جلد اول ص ۳۰۴-۳۰۵)

حضور نے اس شخص سے پوچھا تھا کہ تو ان اصنافِ ثمانیہ میں سے کسی صنف کے تحت ہے جو میں زکوٰۃ میں سے تیرا حصہ لگاؤں۔ کیا ہم بھی اصلاحی صاحب سے دریافت کر سکتے ہیں کہ نیکی اور خدمتِ خلق کے جن کاموں کی فہرست انھوں نے دی ہے (یہاں تک کہ لاوارث میت کی لاش کی تجہیز و تکفین بھی) وہ ان مصارفِ ثمانیہ میں سے کس کس مصرف کے تحت آتی ہے جو انھیں رقومِ زکوٰۃ سے پورا کرنے کی وجہ جواز پیدا ہو سکے۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ جب اللہ عزوجل تقسیم زکوٰۃ کے باب میں نبیِ مرسل کے حکم کے ساتھ تو راضی ہوا نہیں بلکہ آسمان سے خود اُس کے باب میں حکم محکم نازل فرمایا تو کیا ہمارے لئے اس حکمِ خداوندی کے بعد گنجائش رہ گئی ہے کہ ہم "زکوٰۃ کے ذریعہ سے نیکی اور خدمتِ خلق کے وہ کام انجام دے سکیں جن میں سے بعض کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے"

ختمِ مقال سے پیشتر ایک غلط فہمی کا ازالہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ شاید بعض قلوب میں خلجان پیدا ہو کہ فقہاء اس درجہ ظاہر پرست (Letter list) تھے کہ ایک اصول کی مراعاۃ کی خاطر "زکوٰۃ کے ذریعے سے نیکی اور خدمتِ خلق کے وہ کام بھی انجام نہیں دیتے تھے جو غرباء کی اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہیں" ایسا نہیں ہے۔ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے اور ساتھ ساتھ باضابطہ بھی۔ لہٰذا بیت المال (Public Treasury) کا نظم و ضبط کچھ ضوابط کے ساتھ ہوتا تھا یہ نہیں کہ جو آمدنی ہوتی گئی "کل شیئ فی جوف الفراء" کے مصداق ایک بھنڈار خانہ میں جمع ہوتی رہی اور جس خرچ کے لئے ضرورت ہوئی اسی عمر و عیا یہ کی زنبیل میں سے رقم نکالی جاتی رہی۔ جن لوگوں نے عہدِ حاضر کے متمدن ممالک کے مالیاتِ عامہ (Public Finances) کی تنظیم کا مطالعہ

کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ آمدنی وخرچ کی مختلف مدات ہوا کرتی ہیں اور ایک مد کی آمدنی نہ دوسری مد میں جمع ہوسکتی ہے اور نہ ایک مد کا خرچ دوسری مد سے خرچ کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی بیت المال کی تنظیم بھی اسی اصول پر ہوئی تھی۔ اس کی تفصیل مولانا ظفر احمد صاحب نے اپنے مضمون میں بہت اچھی طرح دی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں، مزید تفصیل کے لئے قارئین شمس الائمۃ السرخسی کی المبسوط ملاحظہ فرمائیں (الجزء الثالث ص۱۷-۱۸) لہٰذا نیکی اور خدمتِ خلق کے جن کاموں کا حوالہ اصلاحی صاحب نے دیا ہے اُن میں سے پہلے چھ کے مصارف خراج کی مد سے ادا کئے جاتے تھے اور ساتویں کا صدقہ چوتھی مد سے دیا جاتا تھا۔ یوں اگر اہلِ خیر چاہیں تو زکوٰۃ کے علاوہ اپنی کمائی میں سے اجتماعی فلاح وبہبود اور رفاہِ عامہ کے کاموں کی تعمیر میں خرچ کریں بقول شاعر ع

پُل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

مگر صدقات زکوٰۃ وعشر کا صرف مصارفِ ثمانیہ پر مقصور ہے۔ نام نہاد نیکی اور خدمت خلق کے کسی کام کو فقراء کا پیٹ کاٹ کر انجام نہیں دیا جاسکتا اور اگر کوئی اس کی تجویز کرتا ہے تو اپنے لئے اُس مرتبہ کا مدعی ہے جس سے افضل الانبیاء صلوات اللہ علیہم نے دستبرداری کا اعتراف کیا جیسا کہ ابھی ابھی زیاد بن حارث الصدائی کی حدیث میں بحوالہ طحاوی گذر چکا ہے

غرض مصارفِ زکوٰۃ اور اس کا طریقِ ادا قیامت تک کے لئے مقرر ہوچکا ہے۔ حکم محکم ہے اور کسی ترمیم واصلاح یا نسخ کا محتمل نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ اصلاحی صاحب باوصف اپنے علم وفضل اور خلوص و دیانتداری کے اسے محض ایک انتظامی معاملہ سمجھتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں

"اسلامی حکومت اختیار رکھتی ہے کہ ...... اگر چاہے تو کسی مرکزی اسکیم کے تحت پورے ملک کی زکوٰۃ کنٹرول کر کے اس کو ملک کے غرباء کی کسی نفع بخش اسکیم میں لگا دے جس سے سب کو فائدہ پہنچے"

(ترجمان القرآن جلد ۵۴ عدد ۱ ص۳۴)

اگر کوئی قرآن وحدیث سے ناواقف شخص ایسا غیر ذمہ دارانہ فتویٰ دیتا تو چنداں حیرت نہ ہوتی مگر یہ ایک ذمہ دار کبیر جماعت کا فتویٰ ہے جن کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ وہ علوم قرآن وحدیث سے بے بہرہ

نہیں ہیں۔ کاش کہ وہ یہ فتویٰ صادر فرمانے سے پہلے یہ دیکھ لیتے۔

۱۔ حکومتیں غربار کی نفع بخش اسکیموں ہی کے نام سے مُترفین و اہلِ دول کی تجوریاں بھرنے کے لئے ملک کی آمدنی لگایا کرتی ہیں۔

۲۔ زکوٰۃ نہ تو سب غربار کے فائدے کے لئے ہے اور نہ اس مقصد کے لئے کہ اس کے ذریعے (جیساکہ اصلاحی صاحب فتویٰ دیتے ہیں) سب کو فائدہ پہنچے۔ ورنہ پھر انما کے ذریعے حصر و قصر کا کیا فائدہ ہوا۔

زیاد بن حارث الصدائی کی حدیث جسے امام طحاوی نے روایت کیا ہے افضل الانبیا تک سے اس قسم کے اختیارات کو مسلوب کر رہی ہے۔

لیکن اصلاحی صاحب کے ساتھ دقت یہ ہے کہ وہ اسلامی حکومت کی عظمت و پستی کو اُسی پیمانے سے ناپنا چاہتے ہیں جس سے لادینی حکومتوں کے خوب و ناخوب کی پیمائش کی جاتی ہے اگر اسلام کی کوئی تعلیم اس معیار پر پوری اُتری ہے تو اپنانے کے قابل ہے ورنہ نہیں۔ فرماتے ہیں۔

"قطع نظر اس سے کہ موجودہ زمانہ کی حکومتیں جو محاصل کی تشخیص و تحصیل کے معاملہ میں جدید نظریات کی معتقد ہیں اور ہر کام کو منصوبہ بندی کے تحت کرنا پسند کرتی ہیں، اس چیز کو اپنا سکتی ہیں یا نہیں اس میں دو نہایت واضح قباحتیں ایسی ہیں جن کو ایک عام آدمی بھی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا ایک تو یہ کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو علاقے زیادہ پست حال ہیں وہ برابر پست حال ہی رہیں کم از کم زکوٰۃ کی مدسے ان کی اصلاح و ترقی میں کوئی قابلِ ذکر حصہ نہیں لیا جا سکتا .... دوسری یہ کہ کوئی حکومت کسی منصوبہ بندی کے تحت اپنی زکوٰۃ کی پوری آمدنی کسی ایسی دور بیں اور مفید اسکیم پر نہیں خرچ کر سکتی جس سے اس ملک کے پست حالوں اور غریبوں کو بحیثیت مجموعی کوئی مستقل فائدہ پہنچے حالانکہ موجودہ زمانہ منصوبہ بندی کا زمانہ ہے"

حالانکہ جیساکہ مقدمہ رابعہ میں بالتفصیل بیان ہو چکا ہے ہمارے ذہنی اضطراب و فکری انتشار کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم لادینی نظاموں کے معیارِ خوب و ناخوب سے دین کے نظام کو جانچنا چاہتے

ہیں۔ لیکن قرآن کا حکم اس باب میں صاف اور غیر مبہم ہے

"ولا تمدن عینیک الی ما متعنا بہ ازواجا منھم زھرۃ الحیوۃ الدنیا لنفتنھم فیہ ورزق ربک خیر و ابقی"۔

مگر مولینا کے دل و دماغ پر اقتصادی منصوبہ بندی (Economic Palanning) اور دور رس تجاویز (Long Term Development sche-mes) اس درجہ چھائی ہوئی ہیں کہ انھیں اسوۂ رسول و فرمانِ رسالت کا بھی خیال نہیں۔ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا معیاری طریقہ

"کہ محصلین زکوٰۃ ہر جگہ کھیتوں کھلیانوں اور چراگاہوں میں پھیل جائیں، زکوٰۃ وصول کریں اور وہیں غرباء میں تقسیم کردیں"[1]

جسے اصلاحی صاحب مولانا ظفر احمد صاحب کا من گھڑت بتلاتے ہیں حقیقتاً فرمانِ رسالت

"ان اللہ افترض علیھم صدقۃ توخذ من اغنیاءھم فترد فی فقرائھم"

کی تعبیر اور اسوۂ رسول

"قدم علینا مصدق النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلخذ الصدقۃ من اغنیاءنا فجعلھا فی فقرائنا"

کی پیروی ہے اور اس حیثیت سے

"وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم"

کے حسب الارشاد واجب الاتباع اور

"ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ"

کے حسب التصریح موجبِ خیر و فلاح ہے اور

"وعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین"

---

[1] ترجمان القرآن جلد ۴۰ عدد ۱ صفحہ ۳۳

کے بموجب واجب الاقتداء ہے۔ لیکن اصلاحی صاحب کی "حرارتِ ایمانی اور جذبۂ سنت پسندی" نے اس میں دو[۲] واضح قباحتیں ڈھونڈھ لیں جیسا کہ فرماتے ہیں۔

"اس میں دو[۲] نہایت واضح قباحتیں ایسی ہیں"

حالانکہ اگر اس قسم کی گستاخی منکرینِ حدیث کی جانب سے ہوتی تو شاید انھیں گردن زدنی، کشتنی، سوختنی سبھی کچھ قرار دیا جاتا۔ فَانَّا لِلّٰہِ وانا الیہ راجعون۔

اطالت کلام مانع ہے ورنہ تاریخی شواہد پیش کئے جاتے اور اعداد شمار دیئے جاتے کہ نام نہاد "منصوبہ بندی" ہر جگہ حتی کہ اشتراکی روس میں بھی ناکام رہی اور اسی طرح دور رس مفید اسکیمیں صرف مترفین و اہلِ دول کے فائدے کے لئے ہوا کرتی ہیں۔ پھر ایک مردِ مسلمان کا معمول بہ یہی ہے کہ

"وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ"

"اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء"

"وکذالک انزلناہ حکما عربیا ولئن اتبعت اھوائھم من بعد ما جاءک من العلم مالک من اللہ من ولی ولا واق"

اور ہمیں یقین ہے کہ صرف اتباعِ خدا و رسول ہی سے ہماری حیاتِ اخروی کے ساتھ ساتھ حیاتِ دنیوی بھی کامیاب ہو سکتی ہے۔ ہم وہ غلطی نہیں کرنا چاہتے جو اہلِ کتاب نے اتباعِ احکامِ الٰہی کو چھوڑ کر کی تھی، ہمارا یقین ہے کہ وہ اگر ایسا نہ کرتے تو اُن کی دنیوی زندگی بھی عظمت و بلندی کی حامل ہوتی۔

"ولو انھم اقاموا التورٰۃ والانجیل وما انزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم ومن تحت ارجلھم"

غرض اس شوقِ تجدد پسندی کا یہ نتیجہ ہے کہ اصلاحی صاحب نے احکامِ شرعیہ کو وقتی مصالح سمجھ کر اعراض و بے التفاتی کے لئے وجہ جواز پیدا کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں

"سوال یہ ہے کہ ایک انتظامی معاملہ تھا جو محض وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت عمل میں آیا تھا یا شریعت کا قانون ہی یہی ہے کہ

ہر تھانہ بلکہ ہر بستی کی زکوٰۃ اسی تھانہ اور اسی بستی میں تقسیم کر دی جائے؟ نہایت واضح دلائل کی روشنی میں میرا رجحان یہ ہے کہ یہ محض ایک انتظامی معاملہ ہے۔"

کاش مولانا وہ "نہایت واضح دلائل" بھی ثبت قلم فرما دیتے جن کی روشنی میں اُنھیں شریعت کا یہ حکمِ محکم ایک انتظامی معاملہ نظر آرہا ہے! لیکن واقعہ یہ ہے کہ انتظامی اور شرعی کی تدقیق اُن کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔ ورنہ حقیقتاً "واضح دلائل" کی روشنی میں بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک شرعی قانون اور حکمِ محکم ہے۔ دلائل سنیئے۔

اولاً: حدیث معاذ بن جبلؓ "تؤخذ من اغنیاءھم و ترد علی فقرائھم" میں اخذ و رد کا حکم بصیغۂ مضارع مذکور ہوا ہے جو حال اور مستقبل دونوں معنوں میں مستعمل ہوتا ہے یعنی جس طرح عہدِ نبوی میں زکوٰۃ لی جاتی اور تقسیم کی جاتی تھی اسی طرح آنے والے معاشروں میں بھی وصول اور تقسیم کی جائے گی۔

ثانیاً: "ولکم فی رسول اللہ اسوۃ" کا مقتضا ہے کہ عہدِ نبوی کی اس سنت کو برقرار رکھا جائے بلکہ صرف سنتِ نبوی پر مبنی اجتماعی تنظیم کا باز احیاء ہی قیامِ حکومتِ اسلامیہ کا مقصودِ حقیقی ہے۔ اور ترمذی نے جو علی بن سعید الکندی سے روایت کی ہے اُس سے غیر مبہم طور پر ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی میں زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا وہی طریقہ تھا جسے اصلاحی صاحب مولانا ظفر احمد صاحب کی من گھڑت بتا رہے ہیں۔ تو آخر اس اسوۂ رسول کے اتباع اور التزام سنتِ نبوی سے انحراف کی ہمت افزائی کرانے والے کون سے دواعی ہیں۔ محض اس لئے کہ فقراء کے حق سے "حکومتی سطح" کی "ترقیاتی اسکیموں" کو (Finance) نہیں کیا جا سکتا (روپیہ نہیں لگایا جا سکتا) جس سے مترفین و اہلِ دول کی تجوریاں بھر سکیں اُسوۂ رسول کو محض ایک انتظامی معاملہ (وقتی مصلحت) کہہ کر صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے۔

ثالثاً:۔ اُس تملیکِ اجتماعی کی جو منکرینِ تملیک کے پیشِ نظر ہے، کوئی مثال صدرِ اسلام میں نہیں مل سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت کی معاشرتی زندگی اس کے لئے سازگار نہ ہو۔ ...

. . . . ہو سکتا ہے کہ طرقِ دولت آفرینی (Means of Production) اس وقت محض ابتدائی حالت (Primitive state) میں ہوں اس لئے تقسیمِ دولت کا وہ مُرَوّج طریقہ جسے "تملیک اجتماعی" کا نام دیا جا رہا ہے، اُس عہد میں مستعمل نہ ہو۔ لیکن اس قسم کا استدلال تو ایک مارکسیت زدہ منکرِ حدیث کے منہ سے امید کیا جا سکتا تھا جس نے مارکس اور اینجلز کے اشتراکی منشور[1] پر ایمان لا کر "افضل الرسل" کو ایک نیم جاگیردارانہ نظامِ معاشرت کا مصلح سمجھنے پر اکتفا کی ہو لیکن مولانا امین احسن اصلاحی جیسے عالمِ دین سے اس کو توقع نہیں ہو سکتی۔

لیکن اگر بالفرض یہ محض ایک انتظامی معاملہ ہی تھا اور دائمی حکم نہیں تھا بلکہ شریعت میں نام نہاد "تملیک اجتماعی" کی گنجائش ہے تو کم از کم آنے والے زمانے ہی کے لئے اللہ یا اللہ کے رسول نے اس کی جانب اشارہ فرما دیا ہوتا۔ اور اگر ایجابی اشارہ نہ کیا تھا تو کم از کم قرونِ مابعد ہی کے لئے جب کہ طرقِ دولت آفرینی میں اصلاح و ترقی کے پیشِ نظر دولت و ثروت کی غیر معمولی افراط ہونا مقدر ہو چکی تھی تملیک شخصی پر زور نہ دیا ہوتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ شارع علیہ السلام کو آنے والے زمانہ کی دولت و ثروت کا اندازہ تھا مگر اس دولت و ثروت کی فراوانی کے عالم میں جب کہ اس "عہد کی حکومتیں جدید نظریات کی معتقد ہوں گی" اللہ کے سچے رسول کے پیشِ نظر "تملیک فقیر" اور "تملیک شخصی" ہی تھی چنانچہ صحیح مسلم میں حارثہ بن وہب سے روایت ہے

"تصدقوا فیوشک الرجل یمشی بصدقتہ فیقول الذی اعطیھا لو جئتنا بھا بالامس قبلتھا فاما الآن فلا حاجۃ لی بھا فلا یجد من یقبلھا"

دوسری حدیث میں ابو موسیٰؓ سے مروی ہے

"لیأتین علی الناس زمان یطوف الرجل فیہ بالصدقۃ من الذھب ثم لا یجد احداً یأخذھا منہ"

---

[1] Communist manifesto.

تیسری روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس میں غیر مبہم طریقہ پر زکوٰۃ کا ذکر ہے کہ وہ بغیر تملیکِ شخصی کے ادا نہیں ہو سکتی۔

"لا تقوم الساعۃ حتی یکثر المال ویفیض حتی یخرج الرجل بزکاۃ مالہ فلا یجد احدا یقبلھا منہ"

پس اگر یہ محض ایک انتظامی معاملہ تھا جو وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت عمل میں آیا تھا جیسا کہ امین احسن صاحب کا خیال ہے اور آئندہ کے لئے شریعت کا ناقابل تنسیخ حکم نہیں تھا تو قربِ قیامت میں زکوٰۃ دہندہ کو اس دردسری کے دینے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ مال زکوٰۃ لے کر فقیر کو ڈھونڈتا پھرے اور ایک نہ لے تو دوسرے کی اور دوسرا نہ لے تو تیسرے کی خدمت میں وہ پیشکش پیش کرتا پھرے کیوں نہ اس کا حکم دے دیا یا اشارہ کر دیا کہ وہ اسٹیٹ کو یا کسی انجمن و ادارے کو اپنی زکوٰۃ دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائے اور وہ اسٹیٹ یا پبلک ادارہ اس طرح کی رقموں کو "ایک مرکزی اسکیم کے تحت میں کنٹرول کر کے کسی ترقیاتی منصوبہ (developmental scheme) یا رفاہِ عامہ کے کاموں میں لگا دے"۔

لیکن شارع علیہ السلام کو کبھی یہ نام نہاد "تملیک اجتماعی" مقصود ہی نہیں تھی۔ اُن کے پیش نظر اپنے زمانہ سے لے کر قیام قیامت کے زمانہ تک ادائے زکوٰۃ کی جو شکل تھی وہ یہی تھی کہ

"آدمی اپنا مال زکوٰۃ لے کر خود نکلے اور مستحق کو ڈھونڈھتا پھرے اور جب ایک انکار کر دے تو دوسرے کو تلاش کرے خواہ اس میں اسے کتنی ہی دردسری کیوں نہ برداشت کرنی پڑے"۔

غالباً اس منصوص حکم نبوی کے بعد اس بات کے وہم کے لئے کوئی گنجایش نہیں رہتی کہ عہدِ نبوت و زمانۂ صحابہ کی

"توخذ من اغنیاءھم وترد علی فقرائھم"

کی عمومی یا ایسی وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت محض ایک انتظامی معاملہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ حدیث کا سیاق پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ شارع علیہ السلام کے پیش نظر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے

ادائیگی زکوٰۃ کے سلسلے میں تملیکِ شخصی یا تملیکِ فقیر ہی کا اصول تھا۔

غالباً اصلاحی صاحب "تملیک فقیر" کے انکار پر جو اصرار فرما رہے ہیں اُس کا منشا یہ ہے کہ وہ "نیکی اور خدمتِ خلق کے تمام کاموں کو" رقوم زکوٰۃ سے پورا کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے موقف کو مضبوط بنانے کے لئے آیت کریمہ کے آخر میں جو "وفی سبیل اللہ" کا ذکر ہے اس پر خصوصیت سے زور دیا ہے فرماتے ہیں

"فی سبیل اللہ کی مد ایک وسیع مد ہے۔ اس میں نیکی اور بھلائی کے سارے ہی کام داخل ہیں.... اگر اس کے تحت تمام مصارف خیر آتے ہیں جیسا کہ ہر مسلک کے علماء اور ائمہ نے تصریح کی ہے تو تملیکِ شخصی کا تو ان ساری صورتوں میں پایا جانا ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر ممکن ہے تو تملیکِ اجتماعی کا پایا جانا ممکن ہے اور اس سے ہمیں اختلاف نہیں ہے۔ پس اگر بالفرض کسی چیز کے جواز میں اس پہلو سے کسی کو تردد ہے کہ للفقراء کی لام کے یہ منافی ہے تو اس کو چھوڑیئے۔ یہ دیکھئے کہ وہ فی سبیل اللہ کی مد کے تحت آتی ہے یا نہیں۔ اگر آتی ہے تو اس کے جواز کی یہ دلیل کافی ہے۔"

(ترجمان القرآن جلد ۵۴ عدد ۱ ص ۵۶-۵۷)

"فی سبیل اللہ" کی توضیح ہمیں اصل بحث سے دور لے جائے گی لہٰذا اس سے صرفِ نظر مناسب ہے۔ اسے کسی اور وقت کے لئے رہنے دیجئے لیکن اصلاحی صاحب نے جو فرمایا ہے کہ "اس کے تحت تمام مصارفِ خیر آتے ہیں جیسا کہ ہر مسلک کے علماء و ائمہ نے تصریح کی ہے" محلِ نظر ہے۔ شاید ہی کسی نے آیت کریمہ "انما الصدقات للفقراء" میں "وفی سبیل اللہ" سے مراد تمام مصارفِ خیر کو لیا ہو۔ القدوری میں ہے۔

"وفی سبیل اللہ المنقطع الغزاۃ"

المبسوط میں شمس الائمہ السرخسی نے فرمایا ہے

"واما قولہ تعالیٰ وفی سبیل اللہ فھم الفقراء الغزاۃ ھٰکذا قال ابو یوسف"

آگے چل کر انھوں نے اسے صاف کر دیا۔

"وابویوسف رحمہ اللہ تعالیٰ یقول الطاعات کلہا فی سبیل اللہ تعالیٰ ولکن عند اطلاق ہذا اللفظ المقصود بہم الغزاۃ عند الناس"

دیگر مسالک کے متعلق امام شعرانی نے "المیزان" میں لکھا ہے

"ومن ذالک قول الائمۃ الثلاثۃ ان المراد بقولہ تعالیٰ وفی سبیل اللہ الغزاۃ مع قول احمد فی اظہر روایتہ ان منہ الحج" (المیزان للشعرانی ص ۱۳ ج ۲)

یعنی امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک کہتے ہیں کہ فی سبیل اللہ سے مراد غزاۃ ہیں اور امام احمد بن حنبل ج کو بتاتے ہیں یعنی مجموعی طور پر تمام ائمہ کے نزدیک فی سبیل اللہ سے مراد غزاۃ اور حجاج ہیں نہ کہ جملہ مصارفِ خیر۔

اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ قاضی ابوالولید ابن الرشد نے بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد میں فرمایا ہے جو نقل مذاہب کے باب میں نہایت مستند اور معتمد علیہ کتاب ہے۔

"واما فی سبیل اللہ فقال مالک سبیل اللہ مواضع الجہاد والرباط وبہ قال ابوحنیفۃ وقال غیرہ الحجاج والعمار وقال الشافعی ہو الغازی حار الصدقۃ وانما اشترط حار الصدقۃ لان عند اکثرہم انہ لا یجوز تنقیل الصدقۃ من بلد الی بلد الا من ضرورۃ"

(بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد جلد اول ص ۲۳۷)

اس میں امام مالک کا مذہب خصوصیت سے قابلِ غور ہے کہ وہ فی سبیل اللہ سے بالتصریح مواضع جہاد ورباط مراد لیتے تھے لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اصلاحی صاحب نے توطیدِ مقصد اور سخن پروری کی خاطر غلط بیانی اور کتمانِ حق سے بھی دریغ نہیں کیا۔ انھوں نے قاضی ابن العربی مالکی کی کتاب "احکام القرآن" کا ایک اقتباس نقل کیا ہے:۔

"قال مالک سبیل اللہ کثیرۃ۔ احمد واسحٰق قالا انہ الحج"

فی سبیل اللہ کے متعلق امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ اللہ کے راستے بہت سے ہیں۔ امام احمد

والذی یصح عندی من قولھما اور اسحاق کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد حج ہے
ان الحج من جملۃ السبل مع الغزو" لیکن میرے نزدیک ان کے قول کا صحیح منشأ
یہ ہے کہ حج بھی جہاد کی طرح اللہ کے راستوں میں سے ایک راستہ ہے۔ (ترجمان القرآن جلد ۵۲ عدد ۱ ص۵۵)

لیکن مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ قارئین کرام کے سامنے یہ حقیقت پیش کرنی پڑرہی ہے کہ اصلاحی صاحب نے احکام القرآن کی عبارت میں سے سخن پروری اور توطیدِ مقصد کی خاطر ایک پورا ٹکڑا حذف کردیا ہے اور حذف کرنے کا کوئی اشارہ (مثلاً نقطے) بھی نہیں کیا۔ ہم اسے کاتب کے تصرف یا سہوِ قلم پر ہی محمول کر لیتے مگر انھوں نے ترجمہ بھی اپنی کتر بونت کی ہوئی عبارت کا کیا ہے۔ احکام القرآن کے الفاظ یہ ہیں۔

"(المسئلۃ التاسعۃ عشر) قولہ وفی سبیل اللہ قال مالک سبل اللہ کثیرۃ ولکن لا اعلم خلافاً فی ان المراد بسبیل اللہ ھاھنا الغزو من جملۃ سبیل اللہ الا مایوثر عن احمد و اسحٰق فانھما قالا انہ الحج والذی یصح عندی من قولھما ان الحج من جملۃ السبل مع الغزو لانہ طریق بر فاعطی منہ باسم السبیل وھذا یحل عقد الباب ویخرم قانون الشریعۃ وینثر سلک النظر وما جاء قط باعطاء الزکوٰۃ فی الحج اثر"

(احکام القرآن لابن العربی جلد اول ص۳۹۶)

اس میں سے اصلاحی صاحب نے دو جگہ سے خط کشیدہ عبارت اڑادی کیوں کہ اس کے ہوتے ہوئے اُن کی عمارتِ استدلال زمین پر آرہتی۔ لیکن اس کتر بونت میں انھیں یاد نہ رہا کہ احمد و اسحٰق قالا کا جملہ ماسبق سے ربط رکھنے کے لئے کوئی اور عبارت بھی درکار ہے۔

اس تصرفِ بے جا کی توقع ایک عالم تو درکنار ایک عامی سے بھی نہیں کی جا سکتی۔

"فانا للہ وانا الیہ راجعون"

محمود غزنوی پر ایک سرسری نظر

از

(جناب قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت ایم اے)

محمود غزنوی کے ۳۳ سالہ عہدِ حکومت پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی زندگی کے چند لمحات بھی ایسے نہیں جنھیں جدوجہد سے خالی کہا جا سکے اس کے اندر جو وصف سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ اس کی سپاہیانہ و مجاہدانہ اسپرٹ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ محمود جیسا اولوالعزم فاتح عجمی سرزمین اب تک پیدا نہ کر سکی۔ سکندر کے کارنامے محمود کے کارناموں کے آگے ہیچ ہو گئے۔ شمال کے وحشی تاتاری حجیون کے اس پار منتشر کر دئے گئے۔ ایران کی چھوٹی چھوٹی خاندانی حکومتوں کو مٹا دیا گیا۔ اصفہان سے بندیل کھنڈ اور سمرقند سے گجرات تک نامور غزنوی نے ہر ایک دشمن کو زیر کیا اور ہر مدِ مقابل کو نیچا دکھایا۔ محمود جب تخت نشین ہوا ہے تو اس کے قبضہ میں صرف غزنی، بلخ اور بست کے صوبے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس نے حدودِ حکومت کو بڑھایا۔ سیستان۔ غور۔ غرجستان، خوارزم، کافرستان، رے، جبال، اور اصفہان کے صوبے براہِ راست غزنی کی حکومت میں ملا لئے گئے اور قزدار، مکران طبرستان، جرجان، ختلان، صغانیان اور قبادیان کے حکمرانوں نے اس کی بالادستی کو تسلیم کر لیا جنوب و مشرق کی طرف ہندوستان میں لمغان سے لے کر دریائے بیاس کے کنارے تک اور ملتان، بھٹنڈہ اور سندھ کی حکومتوں پر غزنی کا پرچم لہرا دیا۔ علاوہ بریں زیرین کشمیر، قنوج، کالنجر، گوالیار منج، اسونی، نرائن پور اور گجرات وغیرہ کے راجاؤں کو باج گذار بنا لیا۔ اس طرح عراق اور بحر کیسپین سے لے کر دریائے گنگا کے کنارے تک اور بحیرۂ ارل سے لے کر بحیرۂ عرب تک ایک وسیع و عریض حکومت قایم کر کے عجمی سلاطین کی فتوحات کے سابقہ ریکارڈ کو توڑ دیا۔ شرقاً غرباً طول میں اس کی حکومت ۲۰۰۰ میل تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور شمالاً جنوباً چوڑائی ۱۴۰۰ میل تھی۔

محمود فنِ سپہ گری سے زیادہ تدبیرِ جنگ میں ماہر تھا غزنی کے تخت پر بیٹھ کر اس کی عقابی آنکھیں مشرق و مغرب کی ہر چیز پر نظر رکھتی تھیں اس کے دھاوؤں کی تیز رفتاری دشمنوں کو حیرت میں ڈالتی تھی ایک شخص جو اسی جاڑے میں (۱۰۰۶ء) ملتان کے قرمطیوں کو خوف زدہ کر کے، ساتھ ہی بلخ کے تاتاریوں کو شکست دے کر دریائے جہلم کے کنارے ایک باغی صوبے دار (سکھپال) کو گرفتار کرنے کے لئے بھی وقت نکال سکتا ہو اس کے لئے اپنے دلیر مگر سُست قدم معاصرین کے دلوں میں ہل چل مچا دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ پھر محمود باوجود اس مردانگی کے بہت ہی محتاط تھا یہی وجہ ہے کہ اس نے جس کام میں ہاتھ ڈالا اس میں ناکام نہیں ہوا۔ محمود کے ہندوستان پر حملے جن میں اس کی فوجی لیاقت اعلیٰ ترین پیمانے پر نظر آتی ہے حزم و احتیاط اور شجاعت کا حیرت انگیز مجموعہ ہیں۔

جس قدر اس کی دلیری اور حزم و احتیاط لائقِ ستائش ہے اسی قدر اس کے ماتحتوں کی بے خوف جرأت و شجاعت قابلِ داد ہے انھیں ایک شخص کا حکم ماننا اور اس کی اطاعت کرنا سکھایا گیا تھا اس کی فوج میں ترکی، تاتاری، ایرانی، افغانی اور ہندی عناصر الگ الگ ہونے کے باوجود ایک تھے محمود کی تنظیم و تربیت نے انھیں ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند ٹھوس اور ناقابلِ شکست بنا دیا تھا۔ اس کے تمام حریفوں نے بالعموم اور تاتاریوں نے بالخصوص اپنی جانیں کھو کر یہ سبق حاصل کیا تھا کہ صرف جواں مردی اور توکل بہ تقدیر سے ترتیب و تنظیم یافتہ افواج کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

محمود کو اپنے سپاہیانہ جوہر دکھانے کا اس لئے اور بھی موقع ملا کہ اسے خوش قسمتی سے حکومت کے نظم و نسق کے لئے وزیر نہایت ہوشمند و دور اندیش ملے۔ اس لئے اس نے انتظامِ مملکت کا اکثر و بیشتر کام اپنے وزراء پر چھوڑ دیا حکومت کے ابتدائی دو سال تک محمود کے باپ کا وزیر ابو العباس فضل احمد بن اسفرائینی وزارت کا کام انجام دیتا رہا۔ باوجود کم تعلیم پانے کے ملکی، سیاسی اور انتظامی معاملات میں ابو العباس کا علم ایک بحرِ بیکراں تھا اس کے جانشین خواجہ احمد بن حسن میمندی نے ۱۸ سال تک وزارت کا کام نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ وہ بادشاہ کا رضاعی بھائی اور ہم سبق تھا۔ بلحاظِ علم و فضل اور سیاسی فہم و تدبر یگانۂ روزگار تھا۔ سلطان کے لئے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھنا

ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہوتا اگر اس کے وزیر احمد کی انتظامی قابلیت شامل حال نہ ہوتی۔ احمد کے معزولی[1] و مقہور ہونے کے بعد سلطان نے ایک عرصہ تک کسی وزیر کا تقرر نہ کر کے اس امر کا ثبوت دیا کہ اگر ضرورت ہو تو وزارت کا عہدہ توڑا جا سکتا ہے اور بغیر وزیر کے بھی سلطنت کا کام چلانے کی اس کے اندر صلاحیت ہے۔ آخری سالوں میں اس نے احمد حسن بن میکائیل کو جو عام طور سے حسنک کے نام سے مشہور ہے اپنا وزیر بنایا۔ یہ نیا وزیر سلطان کے مقرب دوستوں میں سے تھا اس پر سلطان کو از حد بھروسہ اور اعتماد[2] تھا

محمود غزنوی ایک بہترین سپہ سالار و سیاست داں ہونے کے ساتھ ساتھ تہذیب و شائستگی کے زیور سے بھی آراستہ و پیراستہ تھا۔ مستند کتابوں میں اسے فقیہ مانا گیا ہے۔ اور فقہ میں اس کی ایک مبسوط[3] تصنیف تفرید الفروع موجود ہے۔ فارسی تذکروں اور تاریخوں میں اس کے طبع زاد[4] چند شعر بھی منقول

---

[1] خواجہ احمد بن حسن میمندی کا غیر معمولی عروج لوگوں کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ سلطان کے داماد امیر علی اور سپہ سالار التونتاش کی سرکردگی میں ایک بڑی جماعت اُس کے خلاف قائم ہو گئی۔ بالآخر خواجہ احمد کو ہندوستان کے ایک قلعہ کالنجر میں جو کہ تمام خطرناک قسم کے سیاسی قیدیوں کے لئے بطور کالے پانی کے استعمال ہوتا تھا قید کر دیا گیا۔ وہاں وہ ایک عرصہ تک قید رہا۔ محمود کے بعد اُس کے بیٹے مسعود نے اُسے رہا کر کے اپنا وزیر مقرر کیا۔ [2] احمد حسن ایک مرتبہ حج کو جاتے ہوئے ملک شام سے گذرا جو اس وقت فاطمی خلیفہ مصر کا ایک مقبوضہ تھا خلیفہ مصر نے اسے اپنا طرفدار (اسمٰعیلی) بنانے کی غرض سے خلعت پیش کیا جسے اس نے قبول کر لیا اس پر خلیفۂ بغداد نے صدائے احتجاج بلند کی مگر محمود حسنک کے معقولی عقائد سے واقف تھا اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ محمود اس پر کتنا اعتماد کرتا تھا اس کا اندازہ اس جواب سے ہوگا جو اس نے خلیفہ بغداد کو اپنا ایک معتمد کے ذریعہ سے دیا۔ اُس نے کہا کہ "اس بڈھے خلیفہ کو لکھ دو کہ محض عباسیوں کی خاطر میں نے دنیا بھر سے لڑائی مول لی ہے۔ قرامطہ کو میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتا ہوں اور جس کسی کے متعلق ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ قرمطی ہے تو فوراً اس کو دار پر چڑھا دیتا ہوں اگر یہ تحقیق ہو گیا کہ حسنک قرمطی ہے تو امیر المومنین کو اس کا انجام بھی معلوم ہو جائے گا لیکن اس کی میں نے پرورش کی ہے اور وہ مثل میرے بھائی اور بیٹوں کی ہے وہ قرمطی ہے تو میں بھی قرمطی ہوں۔" آخر میں محمود نے خلعت کو خلیفہ بغداد کے پاس بھجوا دیا۔ جس کو خلیفہ نے جلوا دیا اس طرح خلیفہ بغداد کی تشفی ہو گئی اور بات گئی گذری ہوئی۔ (ملاحظہ ہو بیہقی صفحہ ۲۱۲) [3] ڈاکٹر ناظم صفحہ ۱۵۷ بحوالہ حاجی خلیفہ جلد دوم صفحہ ۳۲۷ و قصیدہ عسجدی کا شعر ؎ بر دادن صلات کتابی بکرد شاہ + چونانکہ بو حنیفہ کتاب صلات کرد، شعر العجم جلد اول صفحہ ۵۵ طبع چہارم [4] بعض طبع زاد اشعار مندرجہ ذیل ہیں ؎

بزخمِ تیغ جہاں گیر و گرز قلعہ کشائے — جہاں مسخرِ من شد چو تن مسخر رائے
بسے بلاد گرفتم بیک اشارتِ دست — بسے قلاع گرفتم بیک فشردنِ پائے

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

ہیں۔لیکن اس کی علم دوستی کا شاید سب سے اچھا ثبوت وہ عالی شان مدرسہ اور کتب خانہ ہے جو اس نے غزنی میں تعمیر کرایا تھا اس کے سالانہ مصارف کے لئے جاگیریں اور گانوں وقف[1] تھے حقیقتاً وہ ایران کی ادبی "نشاۃ جدیدہ" کا عظیم الشان مربی کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ عربی حکومت کے زوال پر جب ایرانی النسل بادشاہوں کی حکومتیں قایم ہوئیں تو ایرانیوں کو اپنی قومی زبان اور قومی روایات کے از سر نو زندہ کرنے کا خیال آیا۔ اور ہر چھوٹا بڑا دربار اس تجدیدی تحریک کا مرکز بن گیا۔ لیکن محمود کی تخت نشینی کے وقت تک فارسی علم و ادب کا سرمایہ نہایت قلیل تھا۔ نثر میں گنتی کی چند کتابیں تھیں نظم میں زیادہ تر قطعات و رباعیات کا رواج تھا۔ قصیدہ و غزل نہایت ابتدائی حالت میں تھے۔ محمود کی قدردانیوں نے نہ صرف تاریخ و اخلاق کے فنون کو ترقی دی بلکہ محمودی شعرار نے شاعری کے اصل فن کو ترقی دے کر زمین سے آسمان پر پہنچا دیا اور شاعری کو اس قابل کر دیا کہ جس قسم کے مطالب چاہیں ادا کر سکیں۔ واقعہ نگاری، معاملہ بندی، اظہارِ جذبات، قدرتی مناظر کی تصاویر، غرض شاعری کے جتنے انواع ہیں سب ان کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ البتہ قصیدہ کے مقابلہ میں غزل پیچھے رہ گئی سو اس فتنۂ خوابیدہ کے جگانے کی ابھی ضرورت بھی نہیں تھی کیوں کہ یہ زمانہ اسلام کی ترقی کے شباب کا تھا۔

محمود کی علمی قدردانی اور شاہانہ داد و دہش نے دور دور کے علماء و شعرار کو کھینچ کھینچ کر غزنی بلا لیا بقول فرشتہ "چار سو متین شاعر سلطان کے ملازم تھے"[2] جن پر وہ سالانہ چار لاکھ دینار خرچ کرتا تھا[3]۔ واقعہ یہ ہے کہ برگزیدہ شعرار کا جو جمگھٹا محمود کے دربار میں تھا ایران و توران کے کسی دوسرے فرمانبردار کو میسر نہیں ہوا ان شعرار کی بذلہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں نے محمود کی فتوحات کو چار چاند لگا دئے۔ جن شعرار نے محمود کے دربار میں شہرت پائی اور جو واقعی آسمانِ سخن کے سبعہ سیارے تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) چو مرگ تاختن آورد ہیچ سود نبود بقار بقائے خداوند و ملک ملک خدائے
(منتخب التواریخ جلد اول صنہ ۲ از ملا عبدالقادر بدایونی)

نوٹ:۔ صاحب تاریخ گزیدہ نے انھیں اشعار کو سلطان محمد بن ملک شاہ سلجوقی کی طرف منسوب کیا ہے۔ [1] تاریخ فرشتہ صنہ ۳۰ [2] ایضاً ص ۳۹ [3] گزیدہ ص ۳۹۵

وہ یہ ہیں۔ "عنصری، فردوسی، اسدی، عسجدی، غضائری، فرخی، منوچہری"[۱]

فردوسی کے سوا باقی تمام شعراء نے قصیدے لکھے ہیں جن میں سلطان کی ہندوستانی فتوحات کی طرف اشارے ہیں۔ "عنصری نے ۱۸۰ اشعار کا قصیدہ لکھا جس میں محمود کی تمام لڑائیاں نہایت تفصیل سے بیان کیں"[۲]۔ عسجدی و فرخی شاید سلطان کی مہم سومناتھ میں شریک تھے۔ عسجدی نے اس کے متعلق ایک زبردست قصیدہ لکھا تھا جس کے فقط چند شعر محفوظ ہیں۔ مطلع تھا۔

تا شاہِ خسرواں سفرِ سومنات کرد　　کردارِ خویش را علمِ معجزات کرد[۳]

اس سے زیادہ پُرزور قصیدہ فرخی کا ہے جو اس نے اس فتح کی یادگار میں لکھا تھا۔ اس قصیدہ میں سفرِ سومنات اور فتح کی تمام تفصیلات درج ہیں[۴]۔ اس قصیدہ میں ۱۷۵ شعر ہیں۔ مطلع ہے

فسانہ گشت و کہن شد حدیثِ اسکندر　　سخن نو آر کہ نو را حلاوتیست دگر

سلطان محمود کی قدر شناسی کا ایک بیّن ثبوت یہ ہے کہ اس نے حکیم بو علی سینا[۵]...... اور ابوریحان بیرونی[۶] کو جو شاہ خوارزم کے دربار میں تھے اپنے خوانِ کرم پر دعوت دی تھی ان کے بلانے کے لئے اس نے اپنا ایک خاص سفیر روانہ کیا جو خود بھی اپنے زمانہ کا ایک نہایت نامور فاضل تھا اس سفیر کا نام خواجہ حسین بن علی بن میکال ہے۔

---

[۱] و [۲] شعر العجم جلد اول ص۵۷ طبع چہارم [۳] قاضی منہاج الدین سراج جورجانی نے اس مطلع کا ایک قصیدہ عنصری کی طرف منسوب کیا ہے اور اس کے دو شعر لکھے ہیں ؎ تا شاہِ خسرواں سفرِ سومنات کرد + آثار غزو را علمِ معجزات کرد شطرنج ملک باخت ملک با ہزار شاہ + ہر شاہ را بلعب دگر شاہ مات کرد (طبقات ناصری ص۱۰)

[۴] دیوان حکیم فرخی ص۶۷ تا ص۷۶ [۵] حکیم بو علی سینا ایک آزاد قسم کا انسان تھا اس نے محمود کے دربار میں آنے سے اس لئے انکار کر دیا کہ سلطان کو اس کے خیالات ناگوار گذرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس جگہ اور جس شہر میں وہ جاتا محمود کے عمّال اس کا تعاقب کرتے یہاں تک کہ بالآخر اس کو رَے کے دیلمی فرمانروا کے یہاں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ برخلاف اس کے بیرونی کو طوعاً و کرہاً غزنی آنا پڑا۔ بو علی سینا کی مختصر سوانح عمری حبیب السیر میں درج ہے۔

[۶] البیرونی کے حالات پر اخفار کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ فقط اس کی تصانیف میں کہیں کہیں اس کے قلم سے اپنی نسبت جو کوئی لفظ ٹپک گیا ہے اسے پھیلا کر اس کی داستانِ حیات ترتیب دینی پڑتی ہے۔ وہ خوارزم (خیوا) کے قریب ایک گاؤں بیرون میں ۳۶۲ھ ۹۷۳ء میں پیدا ہوا، ۲۳ برس تک اپنے وطن میں رہا پھر کئی سال شمس المعالی والئ جرجان و طبرستان کے دربار سے وابستہ رہا اور یہیں "آثار الباقیہ" نامی کتاب ۳۹۰ھ میں مرتب کی اس کے بعد وہ خوارزم چلا آیا۔ سلطان

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

شاعری پر اُس نے جس حوصلۂ شاہانہ سے توجہ کی وہ آپ اپنی مثال ہے۔ ایک موقع پر جب شہزادہ مسعود خراسان سے غزنین آیا اور شعراء نے دربارِ عام میں قصائد پیش کئے تو ایک ایک شاعر کو بیس بیس ہزار اور زینتی اور عنصری کو پچاس پچاس ہزار درہم عطا کئے[1] غضائری رازی کو جو رَے کا ایک شاعر تھا دو شعروں پر دو توڑے (۱۴ ہزار درم) دیئے چنانچہ غضائری خود کہتا ہے ؎

مراد و بیت بفرمود شہریارِ جہاں   برآں صنوبرِ عنبر عذارِ مشکیں خال

دو بدرہ زر بفرستاد و دو ہزار درم   برغم حاسد و تیمار بد سگال نکال

ملک الشعراء عنصری کا منہ ایک برجستہ قطعہ کہنے پر تین بار موتیوں سے بھر گیا[2] یوں بھی عنصری کی جو پہلے ایک نادار شخص تھا دولت مندی مشہور ہے۔ سلطان کی فیاضی کے طفیل چار سو زریں کمر بستہ غلام اُس کے جلو میں چلتے تھے اور ظروف یہاں تک کہ دیگیں تک طلائی یا نقرئی تھیں[3]۔ اُس کا اسبابِ سفر چار سو اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا۔

فردوسی کے سلسلہ میں محمود کے بخیل ہونے کا جو قصہ مندرج ہے وہ حقیقت سے دور اور بے بُنیاد ہے۔ وہ شخص جو چار لاکھ اشرفی سالانہ مستقلاً علماء و شعراء پر صرف کرے جو دار العلوم اور اس کے مصارف کے لئے ایک زبردست جائداد وقف کر دے جو طلباء اور شائقینِ علم کی ہمت افزائی میں ہمیشہ اپنے خزانے کا منہ کھلا رکھے جو حوضوں اور فواروں، پلوں، محلوں، مسجدوں اور خانقاہوں کی تعمیر میں دولتِ خطیر صرف کرنے سے گریز نہ کرے، جو ایک ایک شعر پر تین تین بار ایک شاعر کا منہ جواہرات سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) محمود نے جب خوارزم کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تو اُسے غزنی آنا پڑا۔ یہاں پہلے محمود اور بعد کو مسعود نے اُس کی سرپرستی کی۔ مؤخر الذکر کے نام سے اُس نے "قانونِ مسعودی" معنون کی بالآخرہ، سال کی عمر میں ۱۱۴ سے زیادہ علمی کتابیں لکھنے کے بعد ۱۰۴۸ء میں وفات پائی۔ اُس کی شہرت کا اصل سبب اُس کی وہ معرکتہ الآرا تصنیف ہے جو علمی دنیا میں "کتاب الہند" کے نام سے موسوم ہے۔ انجمن ترقی اُردو ہند دہلی نے اُس کا ترجمہ اُردو میں کرا کر دو جلدوں میں شائع کرا دیا ہے۔ ڈاکٹر سخاؤ جنہوں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ شائع کرایا ہے شہادت دیتے ہیں کہ آج بھی دورِ جدید کی تمام آسانیوں کے باوجود اتنی صحت اور وسعتِ نظر کے ساتھ قدیم ہند پر ایسی محققانہ کتاب لکھنا جیسی بیرونی لکھ گیا ہے سالہا سال کی محنت کا کام ہے۔ بیرونی نے ہندو اور مسلمانوں کے لئے الگ الگ کم و بیش بیس کتابیں لکھی ہیں۔ (مزید مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو علوم عرب جلد سوم باب علوم دخیلہ (ج) مصنفہ علامہ جرجی زیدان و "ہند و عرب کے تعلقات" باب سوم مصنفہ علامہ ڈاکٹر سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم)

[1] بحوالہ شعر العجم جلد اول ص۱۰۸ [2] بحوالہ چہار مقالہ ص۴۵ [3] بحوالہ شعر العجم جلد ا ص۸۹ طبع چہارم

بھر دے، جو ایک معمولی سی اور وہ بھی غیر زبان کی نظم پر اپنی فتوحات سے فائدہ نہ اُٹھا کر ایک غیر مذہب والے مفتوح شخص (راجہ کالنجر) کو پندرہ پندرہ قلعے تفویض کر دے، جس کا دربار دنیا کے ادبا و حکما کا مخزن رہا ہو، کیا اس کی نسبت کوئی دانش مند شخص کہہ سکتا ہے کہ وہ طامع اور بخیل تھا؟ نظامی سمرقندی کے قول کے بموجب فردوسی شاہنامہ کو طوس کے گورنر کی خدمت میں پیش کر کے بطور صلہ حکومت کے محاصل سے آزادی حاصل کر چکا تھا محمود کے ۲۰ ہزار درم کا عطیہ اُس پر مستزاد ہے لیکن شاعر کے نزدیک یہ عطیہ اُس کے حوصلے سے کم تھا اس لئے دوسرے موقع پر محمود کا شاعر کو خوش کرنے کے لئے ۶۰ ہزار دینار بھیجنا اُس کے وسیع القلب اور فیاض ہونے کا بیّن[1] ثبوت ہے۔ محمود کی علم پروری اور ذوقِ ادب کے ثبوت میں جہاں اور بہت سی مثالیں مورخین نے پیش کی ہیں وہیں ایک نمایاں مثال وہ بھی ہے جو صاحبِ طبقاتِ اکبری نے بیان کی ہے اور وہ یہ کہ کالنجر کے راجہ نندا نے یہ دیکھ کر کہ وہ محمود کے محاصرہ کی تاب نہیں لا سکتا تین سو ہاتھی پیش کرتے ہوئے صلح کی درخواست کی چوں کہ اُن ہاتھیوں پر کوئی مہاوت نہ تھا اس لئے محمود نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ انھیں پکڑ کر سوار ہو جائیں چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی۔ نندا یہ دیکھ کر بہت متعجب ہوا اور محمود کی تعریف میں چند اشعار ہندی زبان میں لکھ کر پیش کئے۔ محمود نے اپنے ہندو ساتھیوں سے اُن اشعار کو پڑھوا کر سُنا۔ اشعار اپنے معانی کے لحاظ سے اس قدر بے مثل تھے کہ محمود اپنے صحیح مقصود کو بھی بھول گیا اور اُس نے بے اختیار ہو کر پندرہ قلعوں کی حکومت جن میں کالنجر بھی شامل تھا راجہ کو بخش دی، تحائف و ہدایا اس کے علاوہ تھے فرشتہ نے بھی اس واقعہ کو انھیں الفاظ میں بیان کیا ہے (فرشتہ جلد اول صہ ۵۳)۔ سلطان کے ادبی ذوق کی شاید سب سے عمدہ شہادت یہ ہے کہ اس نے عنصری کو ملک الشعراء کا خطاب دے کر اس خدمت پر مامور کیا کہ وہ سب شعراء کا کلام دیکھے اور بغیر تنقید و اصلاح کسی کے اشعار دربار میں پیش نہ ہوں۔

---

[1] علامہ محمود خاں شیرانی نے فردوسی و محمود پر سیر حاصل بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ فردوسی کے معاملہ میں محمود کو متہم کیا گیا ہے (ملاحظہ ہوں رسائل اردو از مولوی عبدالحق صاحب بابتہ سال ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۳ء)

اِن تمام واقعات کو ممکن ہے کہ ایک نکتہ چیں محمود کے فضائل کے بجائے اُس کے معائب کے دفتر میں لکھے لیکن اسے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ محمود کی یہ فیاضیاں مدح پسندی کی غرض سے نہیں بلکہ فنِ ادب و تاریخ کی ترقی کی غرض سے تھیں اُس نے فردوسی سے شاہنامہ لکھوا کر عجم پر یہ احسان کیا کہ عجم گو خود مٹ گیا لیکن اُس کے کارنامے آج تک نہ مٹ سکے۔ بدائعی بلخی نے نوشیرواں کا نصیحت نامہ نظم کیا۔ اسدی طوسی نے لغات فارسی کی تدوین کی اور فارسی صنائع و بدائع پر ایک کتاب لکھی۔ غرض کہ محمود کی سرپرستی اور شعراء کی عرق ریزی نے فارسی شاعری میں غزل کے سوا ہر صنفِ شعر کو اوجِ کمال پر پہنچایا اور یہی وہ علمی خدمات ہیں جو اُس کے نام کو قرن ہائے دراز تک زندہ رکھنے کی ضامن ہیں اسی چیز کو نظامی عروضی[1] سمرقندی نے اس طرح دکھایا ہے ؎

بسا کاخ کہ محمودش بنا کرد ۔۔۔ کہ در رفعت ہمی با مہ مِرا[2] کرد
نہ بینی زاں ہمہ یک خشت برپائے ۔۔۔ مدیح عنصری ماند است برجائے

یعنی سلطان محمود نے بہت سی عمارتیں بنائیں جو بلندی میں چاند پر چشمک کرتی تھیں اُن کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ پر قایم نظر نہیں آتی لیکن عنصری نے اس کی تعریف میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ آج تک سلامت ہے

محمود غزنوی قانوناً خلیفۂ بغداد کا ایک باج گذار لیکن عملاً بااختیار بادشاہ تھا اُس نے اپنے آقایعنی خلیفۂ بغداد کے اقتدار کو بحال کرنے کے لئے دنیا بھر سے لڑائی مول لے لی۔ قرامطہ کا استیصال اُس نے کیا، تاتاری وایرانی حکمرانوں سے بنرد آزمائی اُس نے کی اور یہ سب خلیفۂ وقت کے خوش کرنے یا پھر اپنی سلطنت کی توسیع واستحکام کے لئے۔ اُس کو اپنے مفتوحہ و مقبوضہ علاقہ سے یکساں لگاؤ تھا۔ محترم پروفیسر حبیب صاحب کا یہ خیال صحت طلب ہے کہ "سلطان ایک وسط ایشیائی حکمراں تھا اور عجم کی تاریخی سرزمین ہی اُس کی امیدوں کا ملجا و ماویٰ تھی"[3] اس میں شبہ نہیں کہ توسیعِ حکومت کے لئے وسط ایشیائی علاقے زیادہ موزوں تھے اور محمود نے اسے نظر انداز نہیں کیا لیکن واقعات شاہد ہیں کہ اُسے

---

[1] بحوالہ چار مقالہ ص ۳۶ [2] علامہ شبلی نعمانی نے شعر العجم جلد اول کے ص ۵۹ پر مصرعہ ۱ "مِرا" کی جگہ "ندا" لکھا ہے اور "در" کی جگہ "از" اس طرح پورا مصرع یوں تحریر ہے "کہ از رفعت ہمی با مہ ندا کرد"
[3] سلطان محمود غزنوی از پروفیسر محمد حبیب صاحب ص ۸۵ ترجمہ

اپنے ہندی مقبوضات و مفتوحات پر بھی بہت ناز تھا۔ پنجاب و سندھ کا باقاعدہ الحاق کر لیا گیا تھا، قنوج و کالنجر اور گجرات کے علاقے باجگذار بنا لئے گئے۔ گو امتدادِ زمانہ سے مقبوضہ و محروسہ علاقے کا بڑا حصہ اس کی اولاد کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن پنجاب آخر تک سلاطین یمینیہ کا ماویٰ و مستقر رہا۔

سلطان کو ہندوستان اور وہاں کے نفائس و نوادر سے جو دلچسپی تھی اُن کی بعض مثالیں تاریخ میں محفوظ ہیں ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر یہ روایت ہے کہ قنوج و متھرا کے سفر سے واپس آنے کے بعد جب اُس نے غزنی میں ایک وسیع و رفیع مسجد "عروسِ بہشتی" اور ایک عالی شان مدرسہ و کتب خانہ کی بنیاد ڈالی تو ان عمارات کے لئے بہترین سنگ مرمر اور سنگِ رخام ہندوستان کی کانوں سے منگوایا اور ان کے متعلق جو باغ لگوایا اس میں درخت بھی ہند و سندھ کے نصب کرائے ان درختوں کو وہاں بویا نہیں گیا تھا بلکہ پرورش یافتہ بڑے بڑے درخت یا پودے بجنسہٖ اکھڑوا کر غزنی منگوا لئے گئے تھے[۱]۔ ایک دوسری روایت کے بموجب سلطان نے سومناتھ کی فتح کے بعد گجرات کو اپنا مستقر بنانے کا ارادہ کر لیا تھا گو اس ارادے پر ساتھ والوں کے جوشِ حبِ وطن کی وجہ سے عمل نہ ہو سکا تاہم یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لئے کیا کم ہے کہ اسے ہندوستان سے دلی لگاؤ تھا۔

مگر ان سب باتوں سے بڑھ کر جو شے اُسے بادشاہ ہند کہلائے جانے کے مستحق گردانتی ہے وہ یہاں کے راجہ مہاراجاؤں کی طرح جنگی ہاتھیوں کی غور و پرداخت اور قدردانی ہے وہ اس "مہیب آلۂ جنگ" کا از حد شائق تھا چنانچہ یہ قصہ مشہور ہے کہ جب محمود نے قلعہ مینیا ایک یا منیج کو ۱۰۱۹ء میں فتح کیا تو گو راجہ چندر رائے بچ کر نکل گیا لیکن اس کا سب سے بڑا ہاتھی جو ہندوستان بھر میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا ایک رات کسی طرح از خود شاہی لشکر میں آ گیا۔ سلطان کو اس سے بے حد خوشی ہوئی اور یہ ہاتھی جسے سلطان پہلے بڑی سے بڑی قیمت پر راجہ سے خریدنا چاہتا تھا اور جسے راجہ نے دینے سے انکار کر دیا تھا "خداداد" کے نام سے شاہی فیل خانہ میں داخل کر لیا گیا[۲]۔ سلطان کے پاس ان ہاتھیوں کی جتنی تعداد[۳] جمع ہو گئی

---

[۱] فرشتہ صفحہ ۳۰۔ ترجمہ تاریخ یمینی میں یہ عبارت نظر سے گزری "و از نواحی اقطار سند و ہند درختے چند بیاورد الخ"

[۲] فرشتہ صفحہ ۳، تحفۃ الکرام صفحہ ۱۲۔ [۳] ۲۵۰۰ ہاتھی غزنی کے فیل خانہ میں تھے۔

تھی اتنی اب تک کسی مسلمان فرمانروا کے وہم وخیال میں بھی نہ گذری ہوگی بلکہ خود ہندو راجہ مہاراجاؤں میں بہت کم ایسے ہوں گے جن کے ہاں فیل خانۂ غزنی کے برابر ہاتھی موجود ہوں۔

سلطان محمود نے جس طرح ہندی ہاتھیوں سے فائدہ اٹھایا اسی طرح ہندی سپاہیوں سے بھی کام لیا۔ معرکۂ نگرکوٹ کے بعد سلطان نے مستقلاً دس بارہ ہزار ہندی فوج ملازم رکھی جو اپنے ہندو سپہ سالاروں[1] کے ماتحت غزنی کے تخت کی حفاظت کے لئے ایران و ترکستان کے معرکوں میں اسلامی فوجوں کے دوش بہ دوش نبرد آزما ہوتی۔ ہندوؤں کے اس فوجی دستے کے علاوہ غیر سپاہی پیشہ ہندوؤں کی تو ۴۰۰ھ کے بعد ہی غزنی میں وہ کثرت ہوگئی تھی کہ فرشتہ کے الفاظ میں "غزنین وراں سال از بلاد ہندوستاں می شمردند"[2] دار السلطنت غزنی میں ہندوؤں کو اپنے معتقدات کے بموجب سنکھ بجانے اور بتوں کی پرستش کرنے کی مکمل آزادی تھی۔ المعری نے رسالۃ الغفران ص۱۵۳ پر ایک عورت کے ستی ہونے کا واقعہ درج کیا ہے۔

الغرض سلطان محمود کے ہندوستان سے دلچسپی لینے کا ہند کی تاریخ پر بڑا گہرا اثر پڑا اوّل تو ممالک سندھ ملتان میں جہاں عربوں کے زوال اور قرامطہ کی بے پروائی سے اسلام کی قوت نہایت ضعیف ہوگئی تھی مسلمانوں کے قدم پھر جم گئے۔ دوسرے پنجاب کا وسیع و سرسبز علاقہ مستقل طور پر سلطنت غزنی کا جز بن گیا جس سے سیاسی، سماجی، علمی اور تمدنی شاندار نتائج برآمد ہوئے، مگر ان سب سے بڑھ کر یہ کہ محمود ہی کے حملوں نے مسلمانوں کو آئندہ تمام ہندوستان فتح کرنے کا راستہ دکھایا۔

اُس کی لڑائیوں کا مقصد اشاعتِ مذہب کبھی بھی نہ تھا بلکہ یہ لڑائیاں دشمنوں سے انتقام لینے اور حکومت کی توسیع کے لئے لڑی گئیں[3]۔ محمود گیارہویں صدی عیسوی کا بادشاہ تھا اس میں قرون اولیٰ کے

---

[1] سوبیندر رائے، تلک ناتھ وغیرہ [2] بحوالہ فرشتہ ص۲۸ [3] اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ غزنوی دور کے مورخین ابوالفضل بیہقی مصنف "تاریخ مسعودی"، اور ابوالنصر عتبی مصنف "تاریخ یمینی" وغیرہ سلطان محمود اور اس کے جانشینوں کے ملازم تھے اس لئے جب کبھی وہ ان بادشاہوں کی جنگوں کا ذکر کرتے تھے تو اپنے مربیوں کو خوش کرنے کے لئے ان کا مقصد تہذیب و مذہب کی اشاعت بتاتے تھے حالاں کہ یہ جنگیں سراسر ملک گیری کے لئے ہوتی تھیں۔ موجودہ زمانہ میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ترقی یافتہ ملک پسماندہ اقوام کو محکوم بناتے وقت اپنا مقصد تہذیب و تمدن کی اشاعت بتاتے ہیں لیکن ان کا اصل مقصد اپنی حکومت اور تجارت کی توسیع ہوتا ہے اسی طرح محمود اور دوسرے بادشاہوں کی لڑائیاں اپنی طاقت اور شان و شوکت کو بڑھانے

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

مسلمانوں کی خوبیاں تلاش کرنا بے کار سی بات ہے۔ لڑائیاں بعض اہم سیاسی وجوہ کے بنا پر لڑی گئیں۔ اس کے جارحانہ اقدام[1] سے ملک کی ثروت کو صدمہ پہنچا ہندوؤں کی قوت پارہ پارہ ہوگئی یہ سب باتیں مسلم اور اپنی جگہ پر صحیح سہی لیکن اُس کے فاتحانہ اقدام کو "اسلام کی طرف سے ہندوؤں کے دلوں میں نفرت کا سبب گردانا[2] صحیح نہیں ہے۔ اس کی ۳۲ سالہ زندگی کا ریکارڈ آپ کے سامنے ہے اُس پر غور کیجئے اور پھر بتائیے کہ اُس نے حالتِ امن میں کس مندر کو محض مذہبی تعصب کی بنا پر لوٹا یا کس ہندو کو زبردستی مسلمان بنایا۔ اس کے برخلاف اُس کی زندگی مذہبی رواداری کی مثالوں سے بھرپور ہے۔ اُس نے راجگان پنجاب کی بدعہدیوں کو باربار انگیز کیا۔ اپنے حلیف راجہ قنوج کی خاطر کالنجر کے دو حلے لگائے بالآخر اس کو بھی اپنا کر چھوڑا۔ راجہ گجرات سے جو کچھ سلوک کیا وہ بھی سامنے ہے پھر کیوں کر اس کی روش کو وجہ منافرت قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہندوؤں کو نہ صرف مسلمانوں سے بلکہ تمام دیگر اقوام سے اجتناب ضرور رہا ہے اور ایک حد تک مہاتما[3] گاندھی جی جیسے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) کے لئے ہوتی تھیں اور یہ چیز اس زمانہ کے ہندو و مسلمانوں دونوں میں یکساں طور پر پائی جاتی تھی۔

بہرحال مورخین کی مذکورۂ بالا خصوصیت کے علاوہ ان کے طرزِ تحریر پر بھی نظر رکھنا چاہئے۔ مبالغہ اور لفاظی فارسی نثر نویسیوں بلکہ عام مشرقیوں کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے اگر اتفاق سے کسی بادشاہ نے ایک دو مندر مسمار کر کے ان کی جگہ مسجدیں تعمیر کردیں تو یہ مورخین تحقیق کئے بغیر اس واقعہ کا ذکر یوں کریں گے۔ گویا ہزارہا بت خانے توڑے گئے اور ان کی جگہ مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ حالاں کہ یہ مبالغہ اور لفاظی کے سوا کچھ نہیں (تصنیف ڈاکٹر حبیب اللہ ص۲۹۵) مثلاً قطب الدین ایبک کے متعلق ایک فارسی مورخ لکھتا ہے کہ اس نے دہلی میں ایک ہزار بت خانے گرا کر ایک ہزار دار العلوم قائم کئے تھے اس بیان کو اگر سنجیدگی کے ساتھ پرکھا جائے تو قطعی ناقابل تسلیم معلوم ہوتا ہے کہ جس بادشاہ نے ایک شہر میں چار سال سے زیادہ حکومت نہیں کی اور یہ چار سال بھی بیشتر لڑائیوں اور دوسری الجھنوں کی نذر ہوئے وہ اس قلیل مدت میں کس طرح ایک ہزار مدرسے قائم کر سکا۔ چنانچہ ڈاکٹر ٹائی ٹس نے مدرسوں کی اس تعداد کو مشکوک قرار دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان ابتدائی مورخوں کی تحریروں کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے زمانۂ حال کے تنقیدی اصولوں سے پرکھنا پڑے گا۔ ان کے ہر بیان کو لفظاً و معناً صحیح سمجھ لینا سخت غلطی ہے۔ ایلیٹ صاحب نے فارسی تواریخ کے لغوی ترجمے مرتب کئے ہیں یہی وجہ ہے کہ انگریزی مورخین جن کی رسائی اصل فارسی کتب تک نہیں ہوتی وہ ترجمے کو پڑھ کر غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

[1] وفٹ نوٹ نمبر ۱۔ سلطان محمود غزنوی از پروفیسر حبیب صاحب ص۱۰۵ ترجمہ [2] آج ہماری گردنیں دنیا کی اقوام کے آگے شرم و ندامت کی وجہ سے جھکی ہوئی ہیں کہ ہمارے ہی ایک ہندی بھائی ناتھورام ونیکسے کے ہاتھوں اس دنیا کے مخلص اعظم کی جان لے لی گئی۔ یہ واقعہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء بروز جمعہ بوقت ۵ ۱/۴ بجے شام کا ہے۔

مخلص ہمدردی کوششوں کے باوجود اس زمانہ میں بھی کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے لیکن غزنوی دور میں اس کے اسباب کچھ اور ہی تھے جن کا تفصیل کے ساتھ البیرونی نے کتاب الہند میں تذکرہ کیا ہے[1]۔ محمود نے تو اس نفرت و مغائرت کو ایک حد تک دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُس نے ہندوؤں کو فوج میں بھرتی کرکے اور مذہبی رواداری سے کام لے کر انھیں اس امر کا موقع دیا کہ وہ مسلمانوں کو قریب سے رہ کر دیکھیں اور سمجھیں۔ اسی طرح اُس نے سازشی و معاند گروہوں کو جو ہندو مسلمانوں کے درمیان منافرت بڑھانے کا سبب ہو سکتے تھے بجائے قتل کرنے کے پکڑ پکڑ کر لا بسایا تاکہ وہ مسلمانوں سے اور مسلمان ان سے مانوس ہو جائیں۔

قدرت نے محمود کو ظاہری حسن و جمال سے محروم رکھا تھا۔ اُس کا قد میانہ اور اعضا متناسب تھے۔ چیچک کے داغوں نے چہرے کی رونق مٹا دی تھی۔ مشہور ہے کہ ایک دفعہ سُلطان آئینہ دیکھ کر بہت ملول ہوا اور اپنے وزیر سے کہنے لگا "بادشاہوں کی صورت رعایا کی بصارت کو قوت بخشتی ہے لیکن عجب نہیں کہ میری شکل دیکھنے والے کی آنکھ کو تکلیف پہنچائے" حاضر جواب وزیر نے عرض کیا "ہزار میں ایک بھی حضور کی صورت نہیں دیکھتا مگر سیرت کا سب پر اثر پڑتا ہے حسب معمول نیکی کی طرف متوجہ رہئے ہر شخص آپ سے محبت کرے گا"[2]۔ محمود کو تمام مورخین نے متفقہ طور پر سلیم الطبع، شجاع، مستقل مزاج، حلیم و بُردبار اور علم دوست تسلیم کیا ہے۔ یقیناً اس کا ایک سبب کچھ تو اس کی فطری صلاحیت تھی جو قدرت نے اس میں ودیعت کی تھی اور دوسرا سبب یہ تھا کہ اس کا اٹھان سبکتگین جیسے بے مثل صفات کے فرماں روا کے ہاتھوں ہوا۔ سبکتگین نے محمود کی تربیت میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہ رکھا تھا چنانچہ مشہور ہے کہ محمود نے اپنی کم سنی میں ایک باغ نہایت محنت سے تیار کرایا اور اس کے وسط میں ایک عالی شان عمارت بھی تعمیر کرائی۔ سبکتگین جب مہماتِ ملکی سے فارغ ہو کر واپس آیا تو اس نے یہ باغ دیکھ کر محمود سے کہا کہ "اے جان پدر ایسے باغ و محلات تو ایک معمولی امیر بھی تیار کرا سکتا ہے میں تو تجھ سے ایسی عمارت کی توقع رکھتا ہوں جس کی نظیر کہیں نہ ملے" محمود نے دریافت کیا کہ وہ عمارت کیسی ہے۔ سبکتگین نے جواب دیا کہ "وہ تعمیر ہے اہلِ

---

[1] کتاب ہذا کی جلد دوم میں اُن وجوہات کو تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ [2] سیاست نامہ اور گزیدہ ص ۲۹۵ کی اس روایت کو ابن اثیر اور سبط ابن الجوزی نے غلط مانا ہے۔ اُن کا کہنا ہے۔ سلطان میانہ قد کا حسین اور خوش رو نوجوان تھا۔ جسم گٹھا ہوا آنکھیں چھوٹی۔ گول زنخداں اور داڑھی کے بال گنے چنے تھے۔

فضل و کمال کے دلوں کی جو قائم رہنے والی ہے اور جس پر کسی نہال کا نصب کرنا ہمیشہ بار آور ثابت ہوتا ہے۔[1] جنھوں نے محمود کی سیرت کا غائر مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ باپ کی نصیحت پر اُس نے کس حد تک عمل کیا اور اس باب میں وہ کس قدر کامیاب ثابت ہوا۔ اسی تربیت کا اثر تھا کہ جوان ہو کر محمود نے سارے عالم کو اپنی شہرت سے معمور کر دیا۔

محمود اپنے بیٹے مسعود کی طرح قوی، پہلوان اور دیو ہیکل نہ تھا لیکن جسم سڈول اور گٹھیلا پایا تھا۔ مسلسل مسافتوں کی تکالیف اس کا جسم بآسانی سہار لیتا تھا۔ بہ حیثیت سپہ سالار کے محمود یہ بخوبی جانتا تھا کہ بلا وجہ جان کو خطرہ میں ڈال دینا بہادری کی دلیل نہیں ہے لیکن اگر کبھی موقع آن پڑا ہے تو محمود ہاتھی پر سوار ہو کر دشمن کے ٹڈی دل میں گھس گیا ہے اور دادِ شجاعت ہی دے کر لوٹا ہے۔ محمود کو جو چیز سب پر غالب کر دیتی تھی وہ اُس کی اعلیٰ دماغی قابلیت تھی۔ سخت سے سخت الجھی ہوئی گتھیوں کو وہ بات کی بات میں ناخنِ تدبیر سے سلجھا دیتا اور ایک نظر میں گرد و پیش کے آدمیوں کی دلی کیفیات کا جائزہ لے لیتا۔ صاحب زینت المجالس نے بحوالہ تاریخ ناصری لکھا ہے کہ محمود ایک مرتبہ ہرات میں آیا تو مجلس وزراء کے ایک امیر عبدالرحمٰن نامی کو قیام کرنے کے لئے ایک نہایت فاضل بزرگ کا مکان دیا گیا۔ یہ مکان نہایت عمدہ اور وسیع تھا۔ امیر کی نیت بگڑ گئی اور اُس نے اس مکان پر اپنا قبضہ جمانا چاہا چنانچہ ایک مناسب موقع پر اُس نے محمود سے اُس بزرگ کی شکایت کی اور کہا کہ "میں ایک دفعہ اچانک اس بزرگ کے حجرہ میں داخل ہو گیا میں نے دیکھا کہ اُس کے سامنے ایک برنجی بت رکھا ہوا ہے اور قریب میں شراب سے لبریز ایک پیالہ۔ اُس نے پہلے شراب پی اور پھر اُس بُت کے سامنے سرنگوں ہو گیا چنانچہ میں اُس بت اور برتن کو لے آیا ہوں جو حکم مناسب ہو دیا جائے"۔ محمود نے حکم دیا کہ "صاحب مکان کو لایا جائے"۔ محمود نے اُس بزرگ کو تھوڑی دیر غور سے دیکھا اس کے بعد عبدالرحمٰن کو بُری طرح ڈانٹا اور کہا کہ "اے بزدل سچ بتا تو نے ایسی لغوبات کیوں کہی اور تو اس درویش کا کیوں دشمن ہو گیا ہے؟ آخر کار عبدالرحمٰن کو اقرار کرنا پڑا کہ یہ جھوٹی شکایت صرف اس لئے کی تھی کہ اس طرح اس کا مکان ضبط کر لیا جائے گا اور مجھے مل جائے گا"۔

---

[1] فرشتہ بحوالہ ماثر الملک جلد اول ص ۲۱

محمود میں حکومت کا مادہ خداداد تھا وہ کبھی نچلا نہ بیٹھتا اپنے دل کا حال گہرے سے گہرے دوست پر بھی ظاہر نہ ہونے دیتا۔ وزیروں اور مصاحبوں سے خلا ملا ضرورت سے زیادہ نہ رکھتا۔ مصاحبوں کو اُمورِ سلطنت میں دخل دینے کی اجازت نہ تھی۔ تیز فہمی اور دور اندیشی اُس کی سرشت میں تھی وہ ہر پہلو سے اپنے فائدے کو پیشِ نظر رکھتا تھا۔ سلطان کے بارے میں عفو و درگذر اور رحم و انصاف کی متعدد روایات ہیں یہاں صرف دو ایک پر اکتفا کیا جائے گا۔

ایک مرتبہ ایک داد خواہ حاضر ہوا اور کہا کہ خلوت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ تخلیہ ہونے پر اُس نے محمود سے کہا کہ "آپ کا ایک عزیز روزانہ رات کو میرے گھر آتا ہے اور مجھے گھر سے باہر نکال دیتا ہے۔ میں انصاف کی غرض سے آپ کے پاس آیا ہوں اگر آپ انصاف کرتے ہوں تو کیجئے ورنہ میں معاملہ کو منصف حقیقی پر چھوڑ دوں" محمود یہ سُن کر آب دیدہ ہو گیا اور کہا کہ آئندہ جس وقت وہ شخص تیرے گھر میں آئے مجھے فوراً اطلاع کر۔ چنانچہ تیسرے روز وہ شخص پھر آیا اور کہا کہ "اس وقت وہ آدمی گھر میں موجود ہے" محمود نے یہ سنتے ہی تلوار ہاتھ میں لی اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک مرد اور عورت پلنگ پر سو رہے ہیں۔ محمود نے فوراً چراغ گُل کر کے اپنی تلوار سے مرد کا سر قطع کر دیا اور پھر چراغ روشن کر کے مقتول کا چہرہ دیکھا اور خدا کا شکر ادا کر کے پینے کے لئے پانی مانگا۔ مستغیث نے چراغ گل کرنے اور پانی پینے کا سبب پوچھا تو کہا کہ "چراغ اس لئے گل کر دیا تھا کہ کہیں مجھے صورت دیکھ کر رحم نہ آجائے اور پانی پینے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک میں اس ظلم کا انسداد نہیں کر لوں گا پانی نہیں پیوں گا۔ آج میں تین دن کا پیاسا تھا اس لئے تشنگی رفع کرنے کے لئے پانی مانگا تھا"

ظالموں سے انتقام لینے میں وہ کس قدر سخت تھا اس کا اندازہ اس حکایت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس نے ایک بار کچھ تحائف فرمانروائے کرمان کے پاس روانہ کئے۔ راستہ میں قزاقوں نے سارا سامان لوٹ لیا اور سفارت کے چند آدمیوں کو بھی قتل کر دیا محمود کو اس واقعہ کی خبر اس وقت ملی جب کہ وہ خوارزم کی طرف جا رہا تھا جب محمود بست میں پہونچا تو شہزادہ مسعود ہرات سے اس کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن محمود نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا۔ وجہ دریافت کرنے پر محمود نے کہا کہ "میں تمہاری صورت کیوں کر دیکھ سکتا ہوں جب کہ

تمہارے علاقے میں ظلم و بے امنی کا یہ حال ہے۔ میں تم سے اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک کہ ڈاکوؤں کے ظلم سے رعایا کی جانیں محفوظ نہ ہو جائیں"، چنانچہ مسعود واپس گیا اور ایک سخت مقابلہ کے بعد اس گروہ کو گرفتار کر کے محمود کے سامنے پیش کیا۔ (سیاست نامہ)۔ اسی طرح عراق کی اُس بڑھیا کا واقعہ نہایت مشہور ہے جس نے اپنا قافلہ لٹ جانے کے بعد محمود کو تنبیہ کی تھی کہ وہ دور و دراز مقامات کا انتظام نہیں کر سکتا تو کیوں اپنے ملک کو اس قدر وسیع کر لیا ہے (سیاست نامہ ص۵۸) الغرض محمود کی یہی انصاف پسندی تھی جس نے فردوسی کو یہ لکھنے پر مجبور کر دیا کہ ؎

جہاں دار محمود شاہ بزرگ — بہ آبشخور آرد ہمی میش و گرگ

چو کودک لب از شیر مادر بشست — بہ گہوارہ محمود گوید نخست

اُس کی دولت کا حساب لگانا محال ہے جو اسے چاروں طرف سے خراج و غنائم کی صورت میں حاصل ہوتی تھی۔ یہ سن کر کہ آلِ سامان کے خزانہ میں جواہرات کی مقدار سات[1] رطل سے زیادہ نہ تھی وہ اگر سجدۂ شکر بجا لایا تو کچھ بے جا نہ تھا کیوں کہ خود اُس کے خزانے میں سو رطل سے زیادہ وزن کے بے نظیر جواہر موجود تھے[2]۔ لیکن وہ اپنے خزانوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہونے والوں میں نہ تھا اُس نے حکومت کے استحکام اور علوم و فنون کی ترقی کے لئے نہایت فیاضی و فراخدلی کے ساتھ روپیہ کو پانی کی طرح بہایا۔ اس کے دربار میں شیعہ، ہندو، عیسائی، یہودی ہر ملت و مذہب کے اہلِ کمال موجود تھے[3]۔

عہدِ غزنوی کے کسی مخصوص قانون یا آئین کا پتہ تاریخ سے نہیں چلتا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ محمود تمام معاملات میں صرف مذہب اور شریعت کے مطابق فیصلہ کرتا تھا اور کسی دوسرے آئین کی ضرورت نہ سمجھتا تھا اور اُس کے متقدمین کا بھی اسی پر عمل تھا۔ اخلاق و عادات کے اعتبار سے اگر اس کو کسی پر فوقیت نہیں دی جا سکتی تو کسی سے کمتر بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ذاتی عقائد کے لحاظ سے محمود ایک سیدھا سادہ مسلمان تھا، وہ خدائے واحد و حاضر کا دل سے معتقد تھا اور یہی ایمان و ایقان کی طاقت تھی جو ہمیشہ اس کے آڑے وقت میں کام آئی اور اُس کے قلب کو مطمئن رکھا۔ خوفِ خدا کے متعلق اُس کے بارے میں ایک روایت مشہور ہے کہ

---

[1] رطل وزن میں غالباً چھ چھٹانک یعنی ۳۰ تولہ کے قریب ہوتا تھا [2] فرشتہ ص۳۶ [3] شعر العجم جلد ۱ ص۱۰۱ طبع چہارم

جب خلیفۂ بغداد نے اسے سمرقند[1] پر قبضہ کرنے کی اجازت نہ دی تو سلطان محمود نے غضب ناک ہو کر ایلچی سے کہا "کیا تم چاہتے ہو کہ میں ایک ہزار ہاتھی لے کر جاؤں اور سمرقند کو تباہ کر کے اُس کی مٹی تک اُن پر لاد کر غزنیں لے آؤں" خلیفۂ بغداد القادر باللہ نے اس کے جواب میں جو مراسلہ بھیجا اس میں بسم اللہ کے بعد صرف ایک سطر تھی اور اس میں بھی صرف ا ل م یہی تین حرف الگ الگ لکھ کر خط کو ختم کر دیا تھا۔ ان حروفِ مقطعات کو دیکھ کر تمام درباری حیران رہ گئے اور دیر تک مطلب سمجھ میں نہ آیا۔ آخر ایک شخص نے بڑھ کر عرض کیا کہ شاید یہ سورۃ "الم ترکیف" کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اصحابِ فیل کی تباہی کا ذکر کیا ہے۔ یہ سنتے ہی سلطان دم بہ خود رہ گیا اور شدّتِ خوف سے اُس کے آنسو جاری ہو گئے۔ ایلچی سے بہت کچھ معذرت کی اور بیش قیمت تحائف کے ساتھ خلیفہ کی خدمت میں عریضۂ ندامت وافسوس لکھ کر بغداد بھیجا۔ محمود فطرتاً بے انتہا منکسر المزاج تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا مالک تھا اور اُس کی فتوحات نے وسط ایشیا اور سرزمین ہند کے ایک معقول حصہ کا احاطہ کر لیا تھا لیکن اُس نے خود کبھی اپنے تئیں سلطان کہلانا مناسب نہیں سمجھا اور نہ "سکوں" میں اپنے نام کے ساتھ لفظ "سلطان" کا اضافہ کیا۔ تختِ خلافت کی طرف سے اُس کو یمین الدولہ، امین الملۃ، کہف الدولۃ والاسلام کے خطابات ملے تھے اور طبقاتِ ناصری کی روایت سے "سلطان" کا خطاب بھی اُس کو دیا گیا تھا[2]۔ لیکن محمود نے ہمیشہ لفظ "سلطان" کے استعمال سے احتراز کیا اور خلیفۂ بغداد کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے کبھی اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھا۔

ایمان باللہ کے ساتھ ساتھ اقرارِ رسالت، قیامت پر ایمان اور شعائرِ اسلامی کا احترام مسلمان پر فرض ہیں۔ محمود کے ہم عصر لوگوں نے یہ افواہیں اُڑائی ہیں کہ وہ قیامت کا قائل نہیں تھا اور اس حدیث کے ماننے میں بھی اسے تامل تھا کہ علماء پیغمبروں کے قائم مقام ہیں۔ آخر کار ایک شب کو خواب میں[3] آنحضرت صلعم کی زیارت

---

[1] علامہ شبلی نے اس روایت کو بغداد پر منطبق کیا ہے ملاحظہ ہو شعر العجم جلد اول ص ۱۰۷ [2] طبقات ناصری ص ۱۹ از منہاج الدین سراج [3] کہتے ہیں کہ سلطان کے دل میں یہ شبہ جاں گزیں تھا کہ سبکتگین اُس کا اصلی باپ نہ تھا ایک روز رات کے وقت جب سلطان محل میں واپس آیا تو اُس کی نظر طلائی چراغ پر پڑی اس نے حکم دیا کہ وہ چراغ اس طالب علم کو دے دیا جائے جو ہر روز رات کی روشنی میں مطالعہ کر رہا تھا۔ اُسی شب کو خواب میں آنحضرت صلعم کی زیارت نصیب ہوئی آپ نے فرمایا "سبکتگین کے بیٹے! تجھ کو خداوند دونوں جہاں میں باآبرو رکھے کیوں کہ تو نے ایک میرے جانشین کا احترام کیا ہے"، اس طرح سلطان کے تینوں شکوک

کے بعد اُس کے شکوک رفع ہوگئے اور وہ اولیاء کرام کی خدمت میں برابر حاضر ہونے لگا اُس کو ابو الحسن خرقانیؒ سے خصوصی ارادت وعقیدت تھی[۱]۔ اگر اس روایت[۲] پر غور کیا جاوے جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے ہم تک پہنچی ہے تو ماننا پڑتا ہے کہ جس طرح وہ اس دنیا میں باآبرو رہا اسی طرح عقبیٰ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اسے سربلند رکھا جو ایک مومن کا منتہائے مقصود ہے۔

---

[۱] بیہقی صہ ۲۳۳۔

[۲] محمود غزنوی کے بارے میں ایک مرتبہ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا کہ " بعد وفات اس کو خواب میں دیکھا گیا پوچھا کہ اللہ نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا اُس نے جواب دیا کہ مجھے اپنے کرم سے بخش دیا اور سبب میری بخشش کا یہ ہوا کہ ایک شب مجھے ایک مکان میں رہنے کا اتفاق ہوا وہاں طاق میں قرآن شریف رکھا ہوا تھا جس وقت نیند کا غلبہ ہوا میرے دل نے چاہا کہ لیٹ جاؤں لیکن طاق میں قرآن شریف رکھا ہونے سے میں نے یہ امر خلافِ ادب جانا اور یہ بھی گوارا نہیں ہوا کہ اپنے آرام کے واسطے مصحف کی جگہ تبدیل کردں۔ الغرض تمام شب بیٹھا رہا اور جاگ کر صبح کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس ادب کی وجہ سے مجھے بخش دیا۔ (ماخوذ از فوائد الفواد)

العلم والعلماء

یہ جلیل القدر امام حدیث " علامہ ابن عبد البرؒ کی شہرۂ آفاق کتاب " جامع بیان العلم وفضلہ " کا نہایت صاف اور شگفتہ ترجمہ ہے۔ علم اور فضیلتِ علم، اہل علم کی عظمت اور اُن کی ذمہ داریوں کی تفصیل پر خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے آج تک کوئی کتاب اس مرتبہ کی شائع نہیں ہوئی اس متبرک کتاب کی ایک ایک سطر سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق ہے موعظتوں اور نصیحتوں کے اس عظیم الشان دفتر کو ایک مرتبہ ضرور پڑھیئے۔

کتاب کا ترجمہ مشہور ادیب اور مترجم مولانا عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی نے کیا ہے موصوف نے یہ ترجمہ مولانا ابو الکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا تھا۔

صفحات ۳۰۰ بڑی تقطیع۔ قیمت غیر مجلد للعہ/ مجلد ۵ؔ/

سورۂ بقرہ کی ایک آیت کی صحیح تاویل

از

(جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی)

دنیا کی محبت بہت بُری چیز ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ اس کی رعنائیاں اور دلفریبیاں بڑے بڑے عالموں اور زاہدوں کے دامنِ تقدس کو داغ دار بنا دیتی ہیں اسی لئے ایک حدیث میں اس کی بابت یوں فرمایا گیا ہے کہ :-

لا اخاف علیکم الفقر بل اخاف علیکم الدنیا — مجھے تمہارے فقر و فاقہ کا خوف نہیں بلکہ دنیوی مال و دولت کا خطرہ ہے

یہود کے حالاتِ زندگی پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ دنیا کی محبت میں بُری طرح گرفتار تھے، دنیا کمانے کے لئے آیاتِ الٰہی میں توڑ مروڑ کرتے تھے وہ دنیا کے مال و دولت پر اس قدر ریجھے ہوئے تھے کہ حیاتِ دنیوی کے سب سے زیادہ دل دادہ اور ہزاروں برس اسی دنیا میں گذارنا پسند کرتے تھے جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے (احرص الناس علی حیوۃ ... یود احدھم لو یعمر الف سنۃ) دنیا پرستی کے نتیجہ میں آخرت کو فراموش کر چکے تھے اور "عمل صالح" سے یکسر تہی دامن ہو گئے تھے سورۂ بقرہ میں ان کی حُبِّ دنیا کی پوری داستان بیان ہوئی ہے کہ جائز و ناجائز ہر طریقہ سے متاعِ دنیوی حاصل کرنے میں منہمک تھے اسی سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دنیا کمانے کا انھوں نے کتنا خوب ایک حربہ یہ بھی فراہم کر لیا تھا کہ سحر و شعبدہ دعا و تعویذ یعنی علوم سفلیہ اور علویہ کو سیکھتے اور سکھاتے تھے تاکہ مال و زر حاصل کریں جیسا کہ فرمایا :-

واتبعوا ما تتلو الشیاطین علی ملک سلیمان وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا یعلمون الناس السحر وما انزل — اور انھوں (علمائے یہود) نے اس کی پیروی کی جو شیاطین عہدِ سلیمان میں پڑھتے تھے اور سلیمان نے کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے کفر کیا جو لوگوں کو سحر سکھلاتے تھے

علی الملکین ببابل ھاروت وماروت	اور بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر جو علم
وما یعلمان من احد حتی یقولا انما	اترا اس کی بھی پیروی کی حالانکہ وہ دونوں یہی کہہ
نحن فتنۃ فلا تکفر فیتعلمون منھما	کر سکھلاتے تھے کہ ہم فتنہ ہیں پس تم کفر نہ کرنا پس یہ لوگ
ما یفرقون بہ بین المرء وزوجہ	ان سے وہ باتیں سیکھتے جس کے ذریعہ میاں بیوی میں
وما ھم بضارین بہ من احد الا	جدائی کرتے حالانکہ یہ اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا
باذن اللہ ویتعلمون ما یضرھم	سکتے مگر اللہ کی اجازت سے اور یہ وہی سیکھتے جس
ولا ینفعھم ولقد علموا لمن اشترٰہ	سے ان کو نقصان ہوتا اور کوئی فائدہ نہ ہوتا حالانکہ
ما لہ فی الاخرۃ من خلاق ولبئس	انھیں خوب معلوم تھا کہ جس نے اسے خریدا اس
ما شروا بہ انفسھم لو کانوا یعلمون	کے لئے آخرۃ میں کوئی حصہ نہیں اور کتنا برا بھاؤ
	تاؤ اپنے ہی ساتھ انھوں نے کیا کاش خود بھی جان لیتے

اس آیت میں بہت سارے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن میں سے بعض نہایت ہی غور و فکر کے محتاج ہیں اس لئے ہم بھی چند سوالات قایم کر کے ان کا جواب دیں گے اللہ تعالیٰ اس کارِ دشوار میں ہماری مدد کرے اور صحیح نقطۂ نگاہ کی تلقین کرے۔

(۱) "وما کفر سلیمان" کا کیا مفہوم ہے اور یہ کہہ کر یہود کے کس خیالِ خام کو باطل کیا گیا ہے

(۲) بظاہر اس آیت میں سحر کو کفر قرار دیا گیا ہے کیا فی الواقع کفر و سحر ایک ہی چیز ہیں اور دونوں میں کچھ فرق نہیں۔

(۳) وما انزل علی الملکین میں "ما" کیسا ہے اور اس کا عطف کس پر ہے؟

(۴) "ما انزل" میں اگر "ما" کو موصولہ مانا جاتا ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سی چیز فرشتوں پر نازل کی گئی تھی۔

(۵) "ملکین" کے متعلق بھی اہلِ تفسیر نے بہت ساری موشگافیاں کی ہیں اس بارہ میں صحیح صورتِ حال کیا ہے؟

اب ان سوالات کے نمبروار جواب ملاحظہ فرمائیے!

۱- میرے نزدیک "وما کفر سلیمان" بطور جملہ معترضہ کے اس لئے لایا گیا ہے کہ یہود اپنی کفریات و سحریات کو حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کرتے تھے اور بعض علماء کا یہ بھی خیال ہے کہ یہود حضرت سلیمانؑ کو نبی نہیں مانتے تھے اور ان کی سلطنت کو اُن کے جادو کا نتیجہ قرار دیتے تھے اس لئے اللہ تعالےٰ نے بتایا کہ حضرت سلیمانؑ نے کوئی کفر نہیں کیا یعنی ان کو سحر و شعبدہ سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ سحر و شعبدہ بازی تو ان شیطانوں کا کام تھا جو حضرت سلیمانؑ کے باغی تھے اور بھاگ کر سحر سیکھتے تھے اس لئے انھیں نے دراصل کفر کیا ہے اور حضرت سلیمانؑ کو کفر و سحر سے کوئی نسبت ہی نہ تھی پس گویا جملہ معترضہ لاکر حضرت سلیمانؑ کو کفر و سحر سے بری قرار دیا گیا ہے اور کفر و سحر کی نسبت باغی اور مفرور شیطانوں کی طرف کی گئی ہے

۲- سحر و کفر میں بعض علماء تفریق کرتے ہیں چنانچہ امام رازی نے سحر کی آٹھ قسمیں قرار دے کر بعض کو کفر اور بعض کو غیر کفر بتایا ہے لیکن فقہاء کا مسلک یہ ہے۔

ائمہ ثلاثہ (امام ابوحنیفہ مالک و احمد رحمہم اللہ) کے نزدیک جادو سیکھنا کفر ہے اور سیکھنے کے بعد جو شخص جادو کا عمل ایک دفعہ کرے تو اس کی سزا قتل ہے لیکن امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ کے عمل کرنے سے نہیں بلکہ بطور عادت چند دفعہ جادو کا عمل کرنے سے ایسا شخص واجب القتل ہو جاتا ہے مگر اس سلسلہ کی روایات سے ائمہ ثلاثہ کے مسلک کو تقویت پہنچتی ہے اور خود اس آیت میں سحر کا کفر ہونا نہایت واضح ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ سحر کی متعدد قسمیں قرار دے کر بعض کو تو کفر میں داخل کیا جاتا ہے اور بعض کو الگ کر لیا جاتا ہے البتہ کفر کے گناہِ کبیرہ اور قبیح ہونے میں تو کسی کا اختلاف نہیں معلوم ہوتا یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے جہاں بھی سحر کا تذکرہ کیا ہے وہاں سحر کی مذمت ہی مقصود معلوم ہوتی ہے کہیں بھی مدح و ستائش کے انداز میں سحر کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اسی لئے پیغمبروں اور رسولوں کو سحر سے بری قرار دیا گیا ہے کہ وہ ایک شیطانی عمل اور قبیح فعل ہے اس لئے سحر کو چاہے کفر مانو یا نہ مانو اس کے مذموم، قبیح اور گناہِ کبیرہ میں تو کوئی تامل ہی نہیں کیا جا سکتا۔

۳- "وما انزل" میں ما کے متعلق اہلِ علم کی کئی رائیں ہیں:-

M. Khalid Osmani, B. Tech.

(الف) ما نافیہ ہے اور "لم ینزل" کے معنی میں ہے اور اس کا عطف "وما کفر سلیمان" پر ہے، عبداللہ بن عباس سے اس کی ایک روایت بھی ہے۔

(ب) ما موصولہ ہے اور اس کا عطف "السحر" پر ہے امام رازیؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے یعنی یعلمون الناس السحر وما انزل علی الملکین۔

(س) ما مجرور ہے اور اس کا عطف "علیٰ ملک سلیمان" پر ہے یہ ابو مسلم اصفہانی کا قول ہے

(ج) ما موصولہ ہے لیکن عطف ما تتلوا الشیاطین پر ہے عبداللہ بن عباس سے اس کی بھی روایت ہے اور جمہور کا یہی مسلک ہے میرے نزدیک بھی گوناگوں وجوہ سے یہی رائے مناسب معلوم ہوتی ہے۔

(۴) اب جب کہ ما کا موصولہ ہونا جمہور کے نزدیک محقق ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرشتوں پر کیا چیز نازل ہوئی تھی اس کے متعلق بھی اہل علم کی کئی رائیں ہیں۔

۱۔ جمہور کے نزدیک "ما انزل" سے بھی سحر ہی مراد ہے یعنی علماء یہود نے شیطانوں اور فرشتوں کے سحر کی پیروی کی تھی،

۲۔ مجاہدؒ کے نزدیک جمہور کے خلاف یہاں سحر کے بجائے تفریق بین المرء وزوجہ مراد ہے جیسا کہ بعد میں اس کا ذکر بھی آیا ہے

۳۔ ابو مسلم نے "ما انزل" سے دین، شرع اور دعوت الی الخیر کو مراد لیا ہے اور اس کا مفہوم یوں بیان کرتا ہے کہ یہود نے جس طرح سحر کو حضرت سلیمانؑ کی طرف یوں ہی منسوب کر دیا تھا اسی طرح دونوں فرشتوں کی طرف بھی افتراءً منسوب کیا تھا حالانکہ اُن پر سحر کے بجائے دین و شرع نازل ہوا تھا اور اسی کی وہ تبلیغ بھی کرتے تھے۔

مگر اس عاجز کو ان اقوال میں سے کسی پر اطمینان نہیں ہو سکا، ابو مسلم اور مجاہد کے اقوال کو تو نظر انداز کر دیجئے خود جمہور کا مسلک کتنا ضعیف معلوم ہوتا ہے کیوں کہ سحر کفر میں داخل ہے اور اگر کفر میں نہ بھی داخل ہو جب بھی اس کے مذموم اور قبیح ہونے پر تو پوری امت کا اتفاق ہو چکا ہے پھر ملائکہ تو معصوم ہیں

وہ بھلا کب اس کی تعلیم و تلقین کرنے لگے اور وہ بھی اس لئے کہ خدا کی طرف سے اس پر مامور ہوں کیا اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز بات کوئی ہو سکتی ہے اس لئے اس قول کے قائلین کی عظمت و برتری کا پورے طور پر احساس رکھتے ہوئے اور احترام ملحوظ رکھتے ہوئے بھی اختلاف کی جرأت کر رہا ہوں ہر چند کہ مجھے اپنی کم علمی اور کوتاہ نظری کا پورا پورا اعتراف ہے اور ان بزرگوں کی جلالت و عظمت کا بھی خوب احساس ہے مگر پھر بھی ع غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد۔

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے نزدیک "وما انزل" کا عطف "ما تتلوا الشیاطین" پر ہے اور شیاطین جو کچھ پڑھتے تھے اس کے متعلق بھی کسی توضیح کی ضرورت نہیں کہ وہ یقیناً سحر تھا جیسا کہ کہا گیا ہے یعلمون الناس السحر اور پھر اس سحر کے کفر ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا نے اس شبہ کو زائل کر دیا اب صرف یہ سوچنا ہے کہ "ما انزل علی الملکین" سے کیا چیز مراد ہو سکتی ہے یہ بالکل ظاہر ہے کہ کفر و سحر نہیں مراد ہے کیوں کہ عطف کرنے کا یہی مطلب ہے کہ دونوں دو چیزیں ہیں اور پھر "من السحر" کا اضافہ بھی یہاں نہیں کیا گیا ہے اور وہاں شیاطین کا ذکر تھا جو علوم سفلیہ (سحر و جادو) سیکھتے سکھاتے تھے اور یہاں ملائکہ کا ذکر ہے جن کے متعلق علوم سفلیہ میں مبتلا ہونے کا کوئی گمان ہی نہیں کیا جا سکتا کہیں "کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم" کے مصداق نہ بن جائے اس لئے میں "ما انزل" سے علوم علویہ (دعا و تعویذ وغیرہ) مراد لیتا ہوں جس کی تعلیم و تلقین پر فرشتے مامور تھے اور جو ایک بہترین کام تھا لیکن یہود نے اپنی بدبختی سے اسے بھی کفر میں داخل کر لیا اور ان فرشتوں سے محبت و نفرت کا عمل سیکھ کر میاں بیوی کے درمیان تفریق کرنے لگے اسی لئے قرآن نے ان کی مذمت بیان کی ہے یعنی قرآن نے ان کی دنیا پرستی کا ایک راز فاش کیا ہے کہ جس طرح سحر و شعبدہ جیسے شیطانی اعمال کا ارتکاب کر کے دنیا کمانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے ٹھیک ویسے ہی انھوں نے دینی راہوں سے بھی اپنے جیب و دامن کو بھر لیا اور دعا و تعویذ میں مبتلا ہو گئے حالانکہ دعا و تعویذ سیکھنے سکھانے میں فی نفسہ کوئی قباحت نہ تھی لیکن ان کے غلط استعمال اور نیتوں کی خامی نے اسے کفر اور نادرست بنا دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی نیتوں ہی کا لحاظ کیا ہے۔

اب چوں کہ میرے نزدیک "ما انزل" سے یہی مراد ہے اور یہ تاویل خواہ اپنی جگہ پر کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو مگر چوں کہ اسے جمہور کی تائید حاصل نہیں ہے اس لئے ممکن ہے کہ لوگ اسے قبول کرنے میں تامل کریں اگرچہ میرا یہ مقصود بھی نہیں ہے کہ لوگ خواہ مخواہ اس ناچیز کے خیال ہی کو ترجیح دیں۔ بہرحال ان ساری باتوں سے قطع نظر میں اپنی تاویل کی درستگی کے سلسلہ میں چند دلائل پیش کر رہا ہوں۔

(۱) یہود آخرت کے تصور کو یکسر فراموش کر کے دنیا پرستی میں اس قدر مشغول اور منہمک تھے کہ جائز و ناجائز ذرائع کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے اور ان کی دیدہ دلیری دیکھو کہ اپنے عقائد و خیالات کو پیغمبروں، ولیوں اور فرشتوں کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیا تھا۔ یعنی ؎

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم جنید و شبلی و عطار ہم مست

اب غور کرو قرآن حکیم نے اس موقعہ پر کیا بتانا چاہا ہے اور کلام کا ربط اور نظمِ آیات کس بات کا مقتضی ہے یہی تو کہ علمائے یہود دینی و دنیاوی جائز و ناجائز ہر دو ذرائع سے مال و دولت کمانے میں مست تھے یعنی صرف ایک ہی ذریعہ پر اکتفار نہیں کیا تھا بلکہ دونوں ہی ذرائع عوام کو فریب دینے کے لئے استعمال کر لئے تھے اس لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صرف علومِ سفلیہ ہی کو ماننے پر اکتفار نہ کیا جائے بلکہ علومِ علویہ کو بھی مراد لیا جائے تاکہ دونوں پہلو بے نقاب ہو سکیں، یا اور بات ہے کہ یہود نے اپنی بدبختی اور اخلاقی پستی کی بنا پر جائز کو بھی ناجائز اور صحیح کو بھی غلط بنا لیا تھا۔

(۲) جادو وغیرہ کے مذموم ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کیا جا سکتا پھر یہ کتنی عجیب بات ہوگی کہ فرشتوں کو اس قبیح عمل کا معلم اور خدا کی طرف سے اسی پر مامور سمجھا جائے علامہ ابن جریرؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ سحر کی تعلیم اس لئے جائز ہے کہ خدا نے خیر و شر دونوں کو پیدا کیا ہے مگر اس پر یہ معارضہ کیا جا سکتا ہے کہ خدا نے شر کو اختیار کرنے اور دوسروں کو اس کی تلقین کرنے کے لئے کب کہا ہے؟

(۳) "وما انزل" کا عطف بھی اس بات کی دلیل بن سکتا ہے کہ دونوں دو جدا جدا چیزیں ہیں۔

(۴) اگر سحر ہی مراد ہوتا تو پھر آیت یوں ہوتی کہ وما انزل علی الملکین من السحر مگر جب ایسا نہیں ہے تو پھر سحر کی طرف کوئی خیال ہی نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اس کو ماننے میں عقل و نقل دونوں اعتبار سے بیشمار

دقتیں پیدا ہوتی ہیں۔

(۵) لفظ انزال سے تو ہماری تاویل کے علاوہ کوئی اور تاویل جمتی ہوئی معلوم ہی نہیں ہوتی کیوں کہ یہ ایک الہامی ہی نہیں بلکہ خدا کی طرف سے وحی معلوم ہوتی ہے اور اول الذکر جو ایک من گھڑت امر تھا اُسے ماتلوا الشیاطین کہا گیا ہے پس اگر قرآن مجید کے اسالیب و استعمالات ہی پر غور کرو تو اس تاویل کے علاوہ اور کوئی تاویل جمتی ہوئی نظر نہ آئے گی۔

(۶) یہی وجہ ہے کہ بعض اہل علم نے جمہور کے مسلک کو ترک کر دیا ہے چنانچہ مشہور تابعی مفسر مجاہد رح اس سے، یفرقون بہ بین المرء وزوجہ کو مراد لیتے ہیں حالاں کہ یہ ایک ضمنی چیز ہے اور حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رح کے ترجمہ سے تو میری ہی تائید معلوم ہوتی ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

"اور اس علم کو جو اترا دو فرشتوں پر"

یہاں شاہ صاحب نے اس "علم" کہہ کر جمہور کے خلاف قدم اٹھایا ہے۔

(۷) امام رازی صاحب وغیرہ نے یہ ثابت کرنے کی سعی فرمائی ہے کہ اس سے وہ سحر مراد ہے جو کفر نہیں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ سحر کفر اور مذموم نہیں ہے تو پھر اس کے سیکھنے اور سکھانے میں قباحت کیا تھی جس پر انھوں نے صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں۔

ان وجوہ سے اس عاجز کو اپنا خیال ہی ارجح اور انسب معلوم ہوتا ہے۔

(۸) ملکین سے جمہور علماء کے نزدیک دو فرشتے مراد ہیں جن کا نام ہاروت و ماروت تھا اور یہی صحیح بھی ہے باقی جو لوگ مَلَکَیْنِ بفتح اللام کو مَلِکَیْنِ بکسر اللام پڑھتے ہیں اور اس سے (رجلین صالحین) (دو صالح آدمی) یا "ملکین من ملوک الدنیا" (دنیا کے دو بادشاہ) مراد لیتے ہیں تو وہ تو کسی طرح درست ہی نہیں ہے اس لئے کہ مشہور و متواتر قرأت پر شاذ قراتوں کو کس طرح ترجیح دی جا سکتی ہے۔

اور جو لوگ حضرت جبرائیل و میکائیل کو مراد لیتے ہیں وہ بھی کسی طرح صحیح نہیں ہے کیوں کہ قرآن نے ہاروت و ماروت عطف بیان یا بدل لاکر خود ہی اس خیال کی تردید کر دی ہے۔

باقی لوگوں نے فرشتوں کے سببِ نزول وغیرہ پر جو روایتیں نقل کی ہیں وہ سراسر خرافات ہیں چنانچہ امام رازی لکھتے ہیں

واعلم ان هذه الرواية فاسدة مردودة غير مقبولة لانه ليس في كتاب الله ما يدل على ذلك

اور جان لو کہ یہ روایت فاسد و نامقبول ہے اس لئے کہ کتاب اللہ سے اس کی تائید ہونا تو درکنار

اس کے بعد امام صاحب نے اپنا پورا زورِ قلم اس بات کے لئے صرف کیا ہے کہ فرشتے کیوں سحر کی تعلیم دیتے تھے لیکن ان کے دلائل اس قدر پھُس پھُسے ہیں کہ ہمیں اس پر اطمینان نہیں ہو سکا باقی ہمارے نزدیک تو سحر کے بجائے علوم علویہ مراد ہیں اس لئے ان کے سیکھنے سکھانے میں کوئی قباحت نہیں کہ اس کا جواب دیا جائے۔

باقی رہا یہ سوال کہ فرشتے یہ سب کچھ سکھانے کے لئے کیوں بھیجے گئے تو میرا خیال ہے کہ اس مسئلہ میں غور و فکر کرنے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں اس لئے کہ قرآن کا نہ تو یہ منشا ہی ہے کہ ہم ان ساری باتوں کو معلوم کرنے کے درپے ہوں۔ اور پھر اسے معلوم کرنے میں ہماری عقل و فکر درماندہ ہو جائیں گے اصل چیز قرآن کے منشاء و مراد کو سمجھنے کی کوشش ہے کہ یہی فہم قرآن کی اصل ہے۔ باقی اس طرح کی تحقیقات کرنے سے نہ تو کوئی فائدہ ہی ہے اور نہ اس طرح قرآن کا مقصد استدلال و تذکیر حاصل ہو سکتا ہے۔

(۵) آخری سوال جو قرآن پاک کے اس فقرہ سے متعلق ہے کہ وما یعلمان من احد الخ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہاروت و ماروت علوم علویہ کی تلقین کرتے تھے۔ مگر یہ کہہ کر ہم تمہارے لئے ابتلاء و آزمائش ہیں اور ہماری باتوں کو اگر غلط طور پر حاصل کیا گیا اور خلوصِ نیت سے کام نہ لیا گیا تو کفر و شرک میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے اس لئے اس علم کو اچھی طرح خلوصِ نیت کے ساتھ سیکھو اور کفر سے محفوظ رہو لیکن یہود نے اس علم کو غلط طور پر استعمال کیا اور اسے اپنے لئے دنیا کمانے کا ایک ذریعہ بنا لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحیح بات کو سیکھ کر بھی وہ اپنے آپ کو کفر سے نہ بچا سکے اور جب محبت و نفرت کا عمل سیکھا تو میاں بیوی کے درمیان جدائی کا ایک طریقہ اسے بنا لیا اس لئے انھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈال دیا اور اپنے ساتھ بڑا ہی برا برتاؤ کیا یہی مفہوم اس فقرہ کا معلوم ہوتا ہے۔

مفتاح الصلوٰۃ

از

جناب پروفیسر شیخ فرید صاحب برہان پوری ایم۔اے
لکچرار رابرٹسن کالج جبلپور

مفتاح الصلوٰۃ کے مصنف ـــ شاہ فتح محمد محدث ـــ حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ کے خلف اصغر اپنے زمانہ کے فاضل اجل۔ حافظ قاری۔ محدث، مفسر اور فقیہ تھے۔ عبد الرحمٰن نام۔ فتح محمد لقب تھا مگر عام طور سے بابا فتح محمد محدث کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

برہان پور ان کا مولد و منشاء ہے۔ اپنے والد بزرگوار شاہ عیسیٰ جند اللہ سے علوم شریعت و طریقت کی تعلیم پائی۔ علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کے بعد ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اُن ہی سے خرقۂ خلافت پایا۔ طریقہ شطاریہ میں منسلک تھے۔

عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ علوم فقہ اور حدیث میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ علم حدیث میں اعلیٰ فضیلت کی بناء پر محدث کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

برہان پور میں ۶۰ سال کی عمر تک علوم دین کی ترویج و اشاعت اور درس و تدریس میں مصروف رہے۔

عشق رسول میں سرشار اور حضرت رسالت مآب کے نام کے شیدائی اور فدائی تھے۔ ان کی زندگی اتباع سنت رسول کا مکمل نمونہ تھی۔ عشق سرور کائنات کی سرشاریاں ان کی تمام تصانیف میں جاری و ساری ہیں۔

مرکز نے انھیں اپنی طرف کھینچا اور زیارت کعبۃ اللہ کے شوق میں برہان پور سے ۱۰۶۴ھ ۱۶۵۳ء میں مدینہ روانہ ہوئے۔ مراسم حج کی ادائیگی کے بعد وہیں سکونت اختیار کر لی اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ سنہ ۱۰۸۰ھ ۱۶۶۹ء میں مدینہ منورہ میں بیمار ہوئے۔ بیماری میں اس سرائے فانی سے عالم جاودانی

کی طرف رحلت کی۔ جنت البقیع میں ان کا مزار ہے۔

علم تصوف اور فقہ میں کئی بلند پایہ تصانیف کے مالک ہیں۔ علم شعر سے بھی بہرہ یاب تھے۔ آپ کا ایک وصیت نامہ اور دیگر تصانیف کے خوشخط نسخے درگاہ برہان الدین راز الٰہی کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ جناب سید اکرام الدین صاحب (سجادہ نشین) کا کرم ہے۔ کہ انھوں نے نایاب نسخے مطالعہ کے لئے عنایت کئے۔

اُن میں سے چند یہ ہیں —

فتوح الاوراد۔ فتوح العقائد۔ مفتاح الصلوٰۃ۔ فتح المذاہب الاربعہ۔ فتح الطریقہ۔ مراتب عوالم خمسہ۔ رسالہ تحقیق نسبِ سیادت۔ رسالہ تحقیق وحدت الوجود وغیرہ وغیرہ۔

سطورِ ذیل میں مفتاح الصلوٰۃ کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

مفتاح الصلوٰۃ فتح محمد محدث کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ ارکان نماز کے فرائض، سنن اور واجبات کی تفصیل پر مبنی ہے۔ خدا کی حمد و ثنا اور نعتِ نبی اکرم کے بعد مصنفین کی عادتِ جاریہ کے مطابق بزرگ محدث نے دعائیہ کلمات —

"بداں تانیک بخت کند ترا خدائے تعالیٰ"

کے الفاظ سے کتاب کی ابتداء کی ہے۔ اس کی بنیاد حروفِ مرموز کے تین اشعار پر رکھی گئی ہے۔ جو کسی سندھی بزرگ نے موزوں فرمائے تھے۔ حضرت مسیح الاولیاء اکثر ان کی تعلیم اپنے فرزندوں کو دیتے تھے۔

"بزرگے از علماء سندھ فرائض وواجبات وسنن را دریں سہ بیت بحروفِ اشارت نظم کردہ است کہ اکثر اوقات بہ فرزندانِ حضرت یعنی شاہ عیسیٰ تعلیم می فرمودندے آں ابیات این است

ابیات

فرائض ندانی شوی در قلق — اُمجبِ نُوقِ تقِقِ رَسقُ

چو واجب ندانی شوی در خطر — فضَتِ تعتّت لُقتِ جبَر

چو سنت ندانی شوی مقتدا   روث ثلث قست ددا

زیرِ نظر کتاب ان اشعار کے اجمال کی تفصیل ہے۔ پہلے شعر میں تیرہ[۱۳] فرائض۔ دوسرے میں بارہ[۱۲] واجبات اور تیسرے میں بارہ[۱۲] سنن کی طرف اشارہ ہے۔

فرائض ______

الف ___ اندام پاک کردن

جیم ___ جامہ پاک کردن

جیم ___ جائے پاک کردن

سین ___ سترِ عورت کردن

نون ___ نیت کردن

واؤ ___ وقت شناختن

قاف ___ مقابل قبلہ استادن

تے ___ تکبیرِ اولیٰ گفتن

قاف ___ قرأت خواندن

قاف ___ قیام کردن

ر ___ رکوع کردن

سین ___ سجدہ کردن

قاف ___ قعدہ آخریں نمودن

واجبات ______

فے ___ فاتحہ خواندن

ضاد ___ ضمِ سورہ نمودن

تے ___ تعینِ قرأتِ دو رکعت نمودن

تے ___ تشہد در ہر دو قعدہ خواندن

قاف ___ در قعدہ اولیٰ نشستن

تے ___ تعدیلِ ارکان نمودن

لام ___ لفظِ سلام آخریں گفتن

قاف ___ قنوتِ وتر خواندن

تے ___ تکبیر در ہر دو عیدین گفتن

جیم ___ جہر خواندن

سین ___ سر خواندن قرأت در عصر و ظہر

رے ___ رعایت ترتیب نمودن

سنن ______

رے ___ رفع یدین

واؤ ___ وضع یمین و یسار

ثے ___ ثنا یعنی سبحانک اللّٰھم خواندن

تے ___ تعوذ خواندن

بے ___ بسم اللہ گفتن

تے ___ تکبیر انتقالات گفتن

تے ___ تسبیح رکوع و سجود گفتن

سین ___ سمع اللہ خواندن

تے ـــــ توقف در قومہ و جلسہ نمودن دال ـــــ دعا خواندن

دال ـــــ درود خواندن الف ـــــ آمین گفتن

مختلف فصول کے ضمن میں عنوانات بالا پر حدیث و قرآن کی روشنی میں کتبِ معتبرہ۔ مستند احادیث۔ اور ائمہ کبار کے مستند اقوال سے تسلی بخش حد تک سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ ٹھوس اور جامع تبصرہ لائق مصنف کی عربی دانی اور فقہ و حدیث میں اعلیٰ دستگاہ پر دلالت کرتا ہے۔

مختلف مصنفین کی تصانیف کے غائر مطالعہ کے بعد مسائل کی بڑی سنجیدگی سے تفہیم کی گئی ہے۔ بعض مقامات پر مصنف کی رائے اجتہادی شان لئے ہوئے ہے۔ بعض مبسوط مسائل کے بیان میں یہ کہہ کر کہ "ایں مختصر گنجایش تفصیل نہ دارد" اختصار سے کام لیا ہے مگر اس اختصار میں بھی تشنگی نہیں۔ ہر پہلو سے بحث کرلی ہے۔

تعیینِ اوقاتِ نماز کے ذیل میں جہاں سایہ کا ذکر ہے۔ وہاں چھ اشعار پر مشتمل ایک بے نظیر اور معنی خیز قطعہ ہے۔ اس کے آخری شعر میں عیسوی تخلص ہے۔

فی از حمل دو نیم پا سوی شمالست دائما وز ثور گردد یک قدم جوزا بود در استوا

از نصف سرطاں یک قدم سوئے جنوبی می شود تا آخرش آں محو شد۔ گشت از اسد آں سایہا

از سنبلہ گردد قدم دو نیم از میزاں شود از عقرب آں سہ نیم شد وز قوس پنج دنیم پا

در نصف جدی آں ہفت شد طرفِ شمالی پیش نہ از دلو آں شد شش قدم تا نیمہ اش بین پنج را

در پانزدہ یک ناقص است۔ در حوت چار است یار تا آخرش نقصاں بدان اے جانِ من یک نیم پا

باز از حمل دو نیم ہست گر عاقلی عامل بشو بہر خدا گفتم بہ تو اے عیسوی ایں نظم را

اِس قطعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ موسموں کے تغیرات کے باعث سایہ کس مقدار سے گھٹتا۔ بڑھتا اور سمت تبدیل کرتا رہتا ہے۔

اقدارِ سایہ کے متعلق ایک جدول دیا گیا ہے۔ قلمی کتاب میں یہ جدول نہیں ہے۔ دو تین ورق خالی چھوڑ دئے گئے ہیں۔

تبلایا ہے ۔ کہ سایہ کا مدار شمسی مہینوں پر ہے ۔

بیت

لا ولا لب و لا لا شش مہ است   لل کط و کط لل شہور کوتا است

تبلایا ہے ۔ کہ برجِ حمل میں نزولِ آفتاب کہ عبارت فروردی ہے تحقیق کرے ۔ بعد تمام سال کا حساب آسان ہوجائے گا ۔

اس مقام پر ایک قطعہ مندرج ہے ۔

قطعہ

ز فروردی چو بگذشتی مہ اردی بہشت آید   بود فرداد تیر آنگہ امرداد ہمی آید

پس از شہریور د از مہر و آبان آذر و دی دان   کہ بر بہمن جز اسفندیار یک ماہی نیفزاید

کتاب کے حاشیہ پر مذکورہ بیت کی تشریح یوں کی گئی ہے

صیف		لل کـ		ط	شتا
لا	لا	لب	میزان	عقرب	قوس
حمل	ثور	جوزا	۳۰	۳۰	۳۱
۳۱	۳۱	۳۲	ربیـ		ع
خریف			کـ	ط	لل
لا	لا	لا	حوت	دلو	حوت
سرطان	اسد	سنبلہ	۲۹	۳۰	۳۰
۳۱	۳۱	۳۱			

وجہ تالیف | یہ رسالہ مصنف نے اپنے خواہرزادے شیخ احمد بن سلیمان کے لئے لکھا ہے ۔

"این رسالہ بجہت احمد بن سلیمان کہ یکے از خواہرزادگانِ این فقیر است بواسطہ صلۃ الرحم تالیف نمودہ شد"

سِن تالیف | ترقیمہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ کتاب ۱۰۶۱ھ ۱۶۵۱ء میں تصنیف کی گئی

"واللہ الموافق والمعین الوافی قال المولف تم مفتاح الصلوٰۃ بید المؤلف سنہ احدی وستین بعد الالف من الھجرۃ النبویہ علی صاحبہا افضل التحیات فی سلخ الشہر الحرام ذی الحجہ ....

ماخذات | مستند ائمہ کبار کی معتبر تصانیف کے جابجا حوالے دیئے گئے ہیں۔ ان حوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے بڑی دقتِ نظر سے ان کا مطالعہ کیا ہے۔

ان میں سے چند یہ ہیں:۔

فتح التقدیر۔ قاضی خاں۔ شرح الہدایہ۔ بدائع۔ ظہیریہ۔ الذخیرہ۔ المجتبیٰ۔ السراج الوہاج۔ صلوٰۃ المسعودی۔ المختار الزیلعی۔ غیون۔ خلاصہ۔ الہدایہ۔ بحر الرائق۔ الفتاوی الولوالجیۃ۔ عوارف المعارف۔ المحیط۔ معراج الدرایۃ۔ شرح المنیہ۔ البغدادی۔ صحۃ القدوری۔ جمع الجوامع۔ القنیہ۔ کنز۔ جواہر الفتاوی۔ کفایۃ المومنین۔ حاشیہ کنز۔ عین المعانی۔ فتح المذاہب۔ فتوح الاوراد۔ کتاب اسرار۔ کشف الاسرار۔ معارج النبوۃ۔ شرح الوقایہ۔ البرجندی۔ قاموس۔ المختار۔

مصحح نے بعد میں چند کتابوں کا اضافہ کر دیا ہے۔

مندرجہ بالا اور دیگر کتب فقہ کے حوالجات اور اقتباسات مصنف کے وسعتِ مطالعہ اور علمی تبحر کے شاہد ہیں۔

مصنف کے ذاتی کتب خانے میں اکثر بیش بہا کتابیں تھیں۔ مکروہات کے ذیل میں حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ "صاحبِ مناسکِ کبیر" شیخ رحمت اللہ کا رسالہ جو تذکرہ سنن و استحباب پر مشتمل ہے ان کے کتب خانہ میں تھا۔

"در تحقیق ایں شیخ رحمت اللہ صاحب مناسکِ کبیر رسالہ جداگانہ نوشتہ اند وسنت و استحباب ان مقرر نمودہ چنانکہ رسالہ مذکور در کتب خانۂ کاتب موجود است"[1]

فاضل مصنف نے ضمنی طور پر اپنی دوسری تصانیف .... فتوح الاوراد فتح المذاہب

[1] مفتاح الصلوٰۃ مطبوعہ ص۱۰۱

الاربعہ۔ رسالہ سایۂ اصلی برہان پور واطراف اور رسالہ فی الزوال کا بھی ذکر کیا ہے اور حوالے دئیے ہیں۔

وضو کے باب میں وضو کے بعد آیۃ الکرسی اور انا انزلنا پڑھنے کے ثواب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

کہ "فتوح الاوراد" میں اس کا ذکر دوسری دعاؤں کے ساتھ کیا گیا ہے۔

"کاتب با ادعیہ دیگر در فتوح الاوراد آوردہ"[1]

دوسری جگہ ص۵۷ پر یہی عبارت "ایزاد نمودہ" فعل کے ساتھ درج ہے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

مفتاح الصلوٰۃ میں مقدماتِ نماز کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے تفصیل فتح المذاہب الاربعہ میں ملاحظہ کیجئے۔

"در مسائل ...... از مقدماتِ نماز اختصار واقع شدہ ہر کہ خواہد مستوعبا معہ دلائلہ و مسائلہ کما یحق وتنبغی ہمہ را

مطالعہ نماید فعلیہ بملاحظہ فتح المذاہب الاربعہ للکاتب فانہ کاف فی المسائل التفصیلیہ و داف للمطالب العلیۃ"[2]

سایہ کے بیان کے ذیل میں لکھا ہے۔ کہ "سایۂ اصلی برہان پور واطراف" ایک علیحدہ رسالہ میں بیان کیا ہے

"درتحقیق سایۂ اصلی برہان پور و اطرافِ او این فقیر در رسالۂ جداگانہ بیان نمودہ است"[3]

اس رسالہ کا حاصل وہ ابیات (قطعہ) ہیں جو اوپر نقل کی گئی ہیں۔ صبح صادق اور صبح کاذب کے بیان

کے ذیل میں ایک رسالہ زوال کا ذکر آیا ہے۔

"در رسالہ فی الزوال بہ تفصیل مؤلف معہ دلیل مذکورہ گردد"[4]

ایک مقام پر مکروہات شمردن آیات و سورۃ کے بیان میں حضرت شیخ طاہر کی حاشیہ کنز کے اقتباس

سے اس مسئلہ کو حل کیا ہے۔ جو صاحبیہ بحرائق اور فتح التقدیر میں محلِ اختلاف تھا۔[5]

دوسری جگہ فصل نماز میں جہاں رکوع وسجود کا بیان ہے۔ اس امر کی وضاحت کہ صلوٰۃ مومن

کی معراج ہے۔ حضرت مسیح الاولیاء کی گرانمایہ تصنیف عین المعانی کے ایک طویل اقتباس سے کی ہے

ہندی الفاظ کا استعمال | عربی اور فارسی کے اس متبحر عالم نے دو تین جگہ اس کتاب میں گھڑی۔ گجر اور پاؤ پہر

کا بلا تکلف استعمال کیا ہے۔ بزرگ محدث نے ایک ہندی یعنی زبانِ اردو لکھا ہے[6]

مختصر یہ کہ مفتاح الصلوٰۃ مصنف کا شاہکار ہے۔

---

[1] مفتاح الصلوٰۃ مطبوعہ ص۹ و ص۵۷، [2] ایضاً ص۲۳ [3] ایضاً ص۲۸ [4] ایضاً ص۳۳ [5] ایضاً ص۱۱۳
[6] ایضاً ص۱۳۲

جامعہ ازہر

(ایک سرسری جائزہ)

ترجمہ

(جناب محبیب الرحمٰن صاحب عثمانی بی۔اے)

(جامعہ نگر دہلی)

جامعہ ازہر مشرق کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں سے ہے۔ ذیل میں ان مختلف دوروں کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے جن سے ہوکر یہ یونیورسٹی گزری ہے اور ایک ہزار سال کے بعد آج اس عظیم مرتبے تک پہنچی ہے۔

فاطمیوں کے دورِ حکومت (۹۷۲ء تا ۱۱۷۲ء) میں جامعہ ازہر

جامعہ ازہر کا سنگِ بنیاد ۹۷۰ء میں فاطمیوں کے سسلی کے کمانڈر جوہر القائد نے رکھا۔ دو سال میں یونیورسٹی کی عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ شروع میں اس کو مندرجہ ذیل کاموں کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔

۱۔ فاطمی خلافت کی جامع مسجد۔

۲۔ اسماعیلی فرقے کی مجلس اعلیٰ (Supreme Council) کا مقام۔

۳۔ واعظ اعلیٰ (داعی الضحیٰ) کا دفتر

۴۔ قاضی القضاۃ کی عدالت۔

اگرچہ تمام دفاتر کے لئے علیحدہ علیحدہ عملہ رکھا جاتا تھا لیکن حقیقتاً خلیفہ ان سب کا سرچشمہ تھا۔ اس لئے سپریم کونسل کے صدر اور امام کی حیثیت سے خلفاء شروع ہی سے الازہر میں اکثر جاتے تھے۔

شبستی کا کہنا ہے کہ ۹۸۹ء میں ایک نو مسلم یہودی اور وزیر یعقوب ابن کلس کو الازہر کی جانب سے یہ کام سپرد ہوا کہ اس عمارت میں ایک تعلیمی شعبہ قائم کرے اور وقت کے بہترین علماء کو کسی بھی قیمت پر اس میں بلائے چنانچہ سلامیہ، شمالی ایران، بصرہ، کوفہ، یمن، مکہ، مدینہ، بغداد، دمشق، یروشلم، قیروان اور ایتھنز وغیرہ سے علماء

کو بلایا گیا اور ایک اکاڈمی قائم کی گئی۔ مشہور علم دوست خلیفہ العزیز (۹۷۵ء تا ۹۹۶ء) اس کے صدر تھے۔ اس میں فاطمی فلسفۂ مذہب کی بنیادی باتوں پر مناظرے ہوئے، اور رفتہ رفتہ فلسفہ، اور پھر سائنس پر بحثیں ہونے لگیں اور اس طرح غالباً ان مفکرین کے بحث و مباحثے سے یونانی اور فاطمی فلسفے کے درمیان باہمی ربط پیدا ہوا ہوگا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یونانی اور فاطمی فلسفوں کے درمیان سمجھوتے اور ترکیب باہمی کی وہی شکل ہوئی ہوگی جیسی یہودی اور یونانی مفکرین نے ان دونوں فلسفوں کے سلسلے میں کی تھی۔ یہ بات اس حقیقت سے اور بھی پختہ ہو جاتی ہے کہ سابق یہودی مدبرین کی اکثریت فاطمیوں کے دور میں سرکاری علما میں شامل تھی۔

العزیز نے الازہر کی جانب سب سے زیادہ توجہ دی اور الحاکم کے دورِ خلافت میں بہت سے کام اس کی ترقی کے سلسلے میں ہوئے۔ حالاں کہ الحاکم (۹۹۶ء تا ۱۰۲۰ء) کے طوائف الملوکی کے دور میں الازہر نے کافی نقصانات اٹھائے۔ تاہم اس کی شہرت اور مقبولیت برابر بڑھتی رہی اور اس حد تک بڑھی کہ کتب خانے کے قیام کے بعد خاص طبقہ کا ہجوم رہنے لگا۔ لائبریری میں نہ صرف کتابوں بلکہ مفت روشنی، کاغذ اور روشنائی کا بھی مفت انتظام کیا جاتا تھا، دوسری وجوہات کے ساتھ اس کتب خانے کی وجہ سے بھی "دار الحکمۃ" کے قیام کے خیال کو تقویت پہنچی۔ فاطمی فرقے کے مخفی اصولوں کا تقاضا یہ تھا کہ الازہر اور دار الحکمۃ کو الگ رکھا جائے۔ دار الحکمۃ وہ جگہ تھی جہاں تمام فرقوں کے عالموں اور سائنس دانوں کو معامل (Laboratrias) میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی اجازت اور مواقع حاصل تھے۔ الازہر کو المستنصر (۱۰۳۵ء تا ۱۰۹۴ء) کے عہدِ حکومت کے وسط میں بہت نقصانات برداشت کرنا پڑے حالاں کہ اسی زمانے میں ایران کے ناصر خسرو جیسے جید عالم یہاں بحیثیت واعظ اور استاد آئے۔ ان کے سفرنامے سے اس زمانے کے حالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس دور کے وزیر اعلیٰ بدر الجمالی نے آخر میں علم کے بہت سے مرکز کھول دیئے جن کی وجہ سے رفتہ رفتہ الازہر کی ترقی پر برا اثر پڑا۔

ایوبی عہدِ حکومت (۱۱۷۲ء تا ۱۲۵۰ء) میں الازہر

ایوبی دور کے ابتدائی زمانے میں الازہر کو اس کے اصل مقام سے محروم کر دیا گیا اس کی وجہ شیعہ سنی اختلافات تھے لیکن صلاح الدین ایوبی (۱۱۶۹ء تا ۱۱۹۳ء) کے ایک سرکاری کارکن نور الدین زنگی نے الازہر کی اہمیت کو محسوس کیا اور کچھ سنی علما کو شیعہ علما کی جگہ رکھا۔ یہ لوگ شیعہ علما سے باعتبار معیار بھی کم تھے اور انہیں کام کا جذبہ

بھی زیادہ نہ تھا۔ صلاح الدین کے بعد تمام ہی خلفاء ناکارہ قسم کے آئے۔ وہ تو حکومت کا کام چلانے ہی کے اہل نہ تھے الازہر کی ترقی اور دوسرے ثقافتی کام تو درکنار۔

مملوکوں کے عہد (۱۲۵۲ء تا ۱۵۱۷ء) میں الازہر

اسی دور میں بغداد اور اسپین کے بہت سے جید عالموں نے مصر میں اور بالخصوص الازہر میں پناہ لی۔ نتیجتاً الازہر پھر نمایاں ہوا۔ اور اس کو وہی مرتبہ حاصل ہو گیا جو پہلے تھا۔ اسی دور میں اسلامی تاریخ کے لئے کچھ فیصلہ کن واقعات ہوئے، حملہ آوروں کی شکست ہوئی۔ منگولوں کے حملے رک گئے۔ اور مغرب میں مسلمانوں کا زوال ہوا لیکن مصر کے لئے یہ سنہری دور تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ الازہر کے لئے۔ اس لئے کہ خلیفۂ بغداد اور دوسرے بڑے بڑے علماء کو اس نے پناہ دی، ان حضرات نے بارہا الازہر کے منبر سے خطبات دیئے۔ اس دور کی حکایات نے اسلامی تاریخ کے واقعات کو مالا مال کیا ہے

عثمانیوں کے دور (۱۵۱۷ء تا ۱۸۰۵ء) میں الازہر

عتیق نے لکھا ہے مصر پر عثمانیوں کی فتح مصر کی آزادی اور تہذیب کے خاتمے کا پیغام لائی۔ الازہر اور دوسرے ادارے اس سے بری طرح متاثر ہوئے۔ حالاں کہ احمد گر الازہر کے مداحوں میں سے تھا اور اس نے سائنس کو پھر داخل نصاب کیا لیکن یہ کوشش محض انفرادی تھی ورنہ عثمانی حکومت کی عام پالیسی میں الازہر کے احیا کا کوئی اشارہ بھی نہ تھا۔ بلکہ اس کے برعکس عثمانی حکمرانوں نے اس کو رجعت پسند درسگاہ بنا دیا تھا تاکہ والیوں کی مطلق العنانی بلا روک ٹوک چل سکے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ازہری عثمانیوں کے خلاف جان توڑ کر لڑے۔ سیدی نے اس کو مشرق میں الازہر کی پہلی جنگ آزادی سے تعبیر کیا ہے۔ سید عمر مکرم اور شیخ عبداللہ شرقوی نے عثمانیوں کے ظلموں کو ختم کرنے اور محمد علی کو تخت نشین کرانے میں لوگوں کی رہنمائی کی۔ خلیفہ بننے کے بعد محمد علی کو الازہر کا روایتی لباس انھی دونوں نے پہنایا تھا۔

علوی خاندان کے دورِ حکومت (۱۸۰۵ء تا ۱۹۴۵ء) میں الازہر

محمد علی (۱۸۰۵ء تا ۱۸۴۸ء) کی طرفداری میں الازہر کے اساتذہ نے پہل کی اور انھی کی بدولت مئی ۱۸۰۵ء میں وہ وائسرائے ہوئے محمد علی ازہر یونیورسٹی کی بہتری اور ترقی کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتے تھے، وہ وہاں کے اساتذہ کی ہمت افزائی کرتے اور ان کے مشوروں کو مانتے تھے انھوں نے الازہر کے طلبا ہی میں سے پہلا گروہ چن کر طب اور قانون کے شعبے قائم کئے۔ ۱۸۲۶ء میں محمد علی نے ایک تعلیمی مشن پیرس بھیجا۔ اس میں ازہری علماء بھی

شامل تھے۔ مصر اور پورے مشرق میں سائنسی علوم کا مرکز قائم کرنے میں الازہر کے علماء کا بڑا ہاتھ تھا۔ ازہری علماء ہی نے انیسویں صدی میں جمہوری طرزِ حکومت کے لئے ایک مجلس قانون ساز بنائی۔ محمد علی نے ان میں سے دس کو پہلی مجلس کا رکن نامزد کیا۔

اسماعیل خدیو (۱۸۶۳ء تا ۱۸۸۲ء) نے مصر کو یورپین اثرات سے متاثر کرنے کی خواہش میں الازہر کے اندر بہت سی اصلاحات کر ڈالیں، مثلاً باقاعدہ نصابِ تعلیم، مجلس ممتحنین اور امتحانات کے باقاعدہ طریقوں کی ابتداء۔ یہ اصلاحات ۱۸۷۲ء میں کی گئیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ کچھ ہی عرصے بعد یہ تمام اصلاحات ناکام ہو گئیں اس کی وجہ اسماعیل کی (Banorapeies) اور شیوخ کی ناکامی تھی۔ شیوخ اپنے فوری مفاد کی خاطر الازہر کی سیاسی جتھہ بندی سے فائدہ اُٹھانے کی دھن میں اندھے ہو گئے تھے۔ انھوں نے ان اصلاحات پر عمل کرنے کی طرف توجہ ہی نہ دی۔

الازھر اور امام عبدہ (متوفی ۱۹۰۵ء)

چونکہ الازہر اسلامی دنیا کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز تھا اس لئے مفتی عبدہؒ نے خیال ظاہر کیا کہ اگر الازہر کی اصلاح کی جائے تو یہ اسلامی دنیا کی بہت بڑی خدمت ہو گی۔ ان کی بڑی کوشش یہ تھی کہ جامعہ ازہر کی تعلیم مغربی طرزِ تعلیم کے ساتھ قدم بہ قدم چلے۔ انہوں نے (Corporate Life) طلباء کی حالت کو بہتر بنانے اور اساتذہ کا معیار بلند کرنے کی طرف بھی بہت توجہ کی۔ امام نے خدیو عباس دوم (۱۸۹۲ء تا ۱۹۰۱ء) پر دباؤ ڈال کر ۱۸۹۵ء میں ایک فرمان شائع کرایا جس کی رو سے اساتذہ کی تنخواہیں لیاقت، مدتِ ملازمت، اور اہمیت کے اعتبار سے بڑھائی گئیں۔ طلباء کو حسب ضرورت کھانے کا سامان مفت دیا جانے لگا۔ اس کے علاوہ صحت و صفائی کی مراعاۃ بھی بہم پہنچائی گئیں۔ طلباء کے قیام اور ان کی رہائش کے مسائل کو حل کیا گیا۔ الازہر کا بجٹ پونے چوالیس لاکھ پاؤنڈ سے ایک کروڑ مصری پاؤنڈ کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں وزارتی پیمانے پر ایک انتظامیہ کمیٹی بھی بادشاہ نے مقرر کی جس میں الازہر کے سینیر پروفیسر اور حکومت کے نمائندے شامل تھے۔ امام عبدہؒ اور شیخ عبدالکریم سلمان نے الازہر میں صحیح معنوں میں اصلاحات لانے کی عظیم کوششیں کیں۔ مجلس انتظامیہ اور ۳۰ اساتذہ کی ایک کمیٹی کے ذمے تعلیمات کے نصاب کے خاکے تیار کرنے کا کام سپرد ہوا۔ اور ریاضی، الجبرا، تاریخ اور جغرافیہ کے مضامین ابتدائی منزل

میں دوبارہ داخل نصاب کئے گئے۔ منزل ثانوی کے طریقے کو جدید رنگ میں تبدیل کیا گیا۔ اور آخری درجے کے امتحان کا معیار مقرر کیا گیا۔ اس کمیٹی نے جامعہ ازہر کے کتب خانوں کی بھی از سر نو تنظیم کی۔ مختلف لائبریریوں کو مختلف عمارتوں میں منتقل کیا گیا۔ ایک مرکزی کتب خانہ بھی قایم کیا گیا۔ تمام کتب خانوں کو باقاعدہ ترتیب دیا گیا اور درجہ بندی کی گئی۔

امام عبدہ کا اصل مقصد اسلامی دنیا کو عالمانہ رنگ میں رنگنے کی تحریک کو الازہر کے ذریعے زندہ کرنا تھا۔ اسی کے پیش نظر وہ الازہر واپس آئے۔ اور وہاں اپنے اچھے شاگردوں کا ایک گروہ چھوڑ گئے ۱۹۰۵ء میں امام عبدہ کے انتقال کے بعد الازہر کی حالت ایک بار پھر سقیم ہونے لگی لیکن ان کے احیاء پسند مقلدین کے بیدار دماغوں کو در غلایا نہیں جا سکا۔ ان لوگوں نے حکومت پر کافی دباؤ ڈالا حتیٰ کہ حکومت اعلیٰ پیمانے کی ایک دوسری کمیٹی بنانے پر مجبور ہو گئی۔ ۱۹۱۱ء میں فتحی زاغلول پاشاہ عبدالخالق، ثروت پاشا اور اسماعیل مہدی پاشا پر مشتمل یہ کمیٹی وجود میں آئی۔ اس کمیٹی کی اہمیت کا اندازہ اس کے اراکین کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ہر شخص ایک سے زائد بار مصر کا وزیر اعظم رہا تھا۔ کمیٹی نے ۱۹۱۱ء کی دفعہ ۱۰ کے نام سے ایک ضابطہ بنایا جس کی رو سے تعلیم کو مختلف منزلوں میں تقسیم کیا۔ ان کے لئے مخصوص مضامین اور ضابطے بنائے اور نصاب تعلیم میں نئے مضامین شامل کئے۔ ریکٹر (Rector) کے اختیارات کا تعین کیا گیا۔ اور یونیورسٹی کے معاملات کی نگرانی کے لئے ان کے اوپر ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس کا اپنا دائرۂ عمل تھا۔ ہر مذہبی ادارے کا ایک شیخ (Principal) نامزد کیا گیا۔ تقررات، ترقیات، نظم و ضبط، رخصت، طلباء کے داخلے، تعطیلات، امتحانات، نصاب اور اساتذہ وغیرہ کے سلسلے میں نہایت اہتمام سے قاعدے اور ضابطے بنائے گئے۔

چوں کہ ۱۹۱۱ء کا یہ ضابطہ الازہر کو ایک جدید رنگ کی یونیورسٹی بنانے سے قاصر رہا۔ اس لئے یونیورسٹی کے اندر اور باہر سے مختلف طبقۂ ہائے خیال کے لوگوں نے مزید اصلاحات کے لئے آوازیں بلند کیں۔ بالآخر ۱۹۳۰ء میں مجلس قانون سازنے ضابطہ ۴۹ نافذ کیا جس کی رو سے تین شعبے (Faculties) قایم کئے گئے یعنی شعبۂ دینیات، شعبۂ فقہ اور شعبۂ زبان عربی۔ درحقیقت اس قانون سے جامعہ ازہر کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے اور اسی کو ہم جامع ازہر کو جدید اور سائنٹیفک یونیورسٹی بنانے کی پہلی سرکاری کوشش کا نام دے سکتے ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں اس قانون پر نظر ثانی کر کے قانون ۲۷ کا نفاذ ہوا تھا۔

الازہر اور شیخ المراغی (متوفی ۱۹۴۶ء)

شیخ المراغی مفتی عبدہ کے شاگرد تھے جو بہت ہی معزز اور بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ ۱۹۳۵ء میں الازہر

کے ریکٹر مقرر کئے گئے۔ حقیقت میں جامعہ ازہر کو ایک مکمل جدید یونیورسٹی بنانے کا اصل سہرا انھی کے سر ہے۔ انھوں نے ۱۹۳۶ء میں قانون ۲۶ کے ذریعے الازہر میں غیر ملکی زبانوں کی تعلیم کا انتظام کرایا۔ الازہر سے طلباء کے وفود تعلیم، فلسفہ، نفسیات، تاریخ اور دوسرے مقبول جدید مضامین میں مخصوص مطالعے کی غرض سے یورپی یونیورسٹیوں کو بھیجے گئے۔

۱۹۳۶ء کے اسی قانون کے مطابق الازہر کا موجودہ نصابِ تعلیم چل رہا ہے۔ ذیل میں اس کا خاکہ پیش ہے:۔

منزل ابتدائی | اس میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔

عربی زبان، گرامر، قرآن کے (Phoretics) شریعت کے ابتدائی اصول، جغرافیہ، ریاضی، اصلِ صحت ڈرائنگ اور خوش خطی۔ ابتدائی مدرسے میں داخلے کے لئے ایک امتحان داخلہ پاس کرنا ضروری ہے۔ اس میں عربی کہانیوں کو صحیح پڑھنا، خوش خطی اور علم ہندسہ کی جانچ کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کا حفظ یاد ہونا بھی ضروری ہے۔ ابتدائی مدرسے میں چار سال کا کورس ہے۔ ہر سال کے اختتام پر زبانی اور تحریری امتحانات ہوتے ہیں اور چوتھے سال کے ختم پر ایک عام امتحان ہوتا ہے۔

منزل ثانوی | اس میں پانچ سال کی تعلیم ہے۔ داخلے کے لئے ابتدائی مدرسے کا سرٹیفکیٹ ہونا لازمی ہے۔ سالانہ امتحانات اور پھر آخری عام امتحان مدرسہ ابتدائی ہی کی طرح ہوتے ہیں ——— نصاب میں اصولِ شریعت، تفسیر، روایت، قرآن کا متن اور اصطلاحیات، سیاسیات، عربی ادب، عروض، گرامر، ناظرہ، صدریات، فنِ خطابت، انشاء، منطق، فزکس کیمسٹری، بائیولوجی اور جغرافیہ شامل ہیں۔ اس امتحان کو پاس کرنے کے بعد طالب علم کو سندی کے کسی بھی شعبے میں داخلے کی اجازت ہوتی ہے۔

منزل سندی (بی۔اے آنرز) | اس منزل میں چار سالہ نصاب اور تین الگ الگ شعبے ہیں۔ تحریری اور زبانی امتحانات سالانہ بھی ہوتے ہیں اور چوتھے سال کے آخر میں عام امتحان ہوتا ہے۔ پرچوں کو دو الگ ممتحن جانچتے ہیں۔ اور زبانی امتحان کے وقت کئی پروفیسر موجود ہوتے ہیں۔ شعبۂ دینیات کے نصاب میں حسبِ ذیل مضامین شامل ہیں:۔

علمِ توحید، تفسیر، قرآنِ کریم کا تنقیدی مطالعہ، علم سلسلۂ نسب، منطق، علم مناظرہ، اخلاقیات، فلسفہ، اسلامی قانون کے اصول، تاریخ اسلام، نفسیات اور انگریزی اور فرانسیسی میں سے کوئی ایک زبان۔

شعبۂ قانون اسلامی کا نصاب | علم تفسیر، روایت کا تنقیدی مطالعہ، اسلامی قانون کے اصول، اصولِ دیان، مسلم

فلسفہ قانون کی تاریخ، منطق، فلسفہ اور انگریزی یا فرانسیسی زبانوں میں سے کوئی ایک اختیاری طور پر ـــــ

شعبۂ زبانِ عربی کا نصاب صوریات، قواعد، فلسفہ، انشاء، عربی ادب، تاریخ ادب عربی، عروض، علم قافیہ پیمائی اور ادبی تنقید، فقہ کے اصول، تفسیر منطق، سماجیات، سیاسی تاریخ اور جغرافیہ ان مضامین کے علاوہ ان میں سے کوئی ایک غیر ملکی زبان (انگریزی، فرانسیسی، ہبرو، فارسی، اور ترکی)

اعلیٰ درجہ (پوسٹ گریجویٹ منزل) کا نصاب اعلیٰ منازل کی تعلیم کو ہر شعبے میں دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۱۔ Professional degree Course اور ۲۔ Subjective degree Course 2

پہلے حصّہ کی مدّت تعلیم دو سال ہے۔ سالانہ امتحانات تحریری اور زبانی ہوتے ہیں۔ دوسرے سال کے آخر میں پبلک امتحان ہوتا ہے۔

دوسرے حصے کی مدّتِ تعلیم تین سے سات سال تک ہے۔ اس میں سالانہ یعنی میعادی امتحانات نہیں ہوتے بلکہ آخری سال تحریری اور زبانی عام امتحان ہوتا ہے۔ جو طلباء امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں صرف ان کو اس کا اہل قرار دیا جاتا ہے کہ وہ کسی ایک مخصوص موضوع پر مقالہ لکھیں۔ ایسے نئے موضوع پر جس پر پہلے نہ لکھا گیا ہو ممتحنین کی رائے معلوم کرنے کے بعد یہ مقالہ پروفیسروں کی ایک جماعت کے سامنے زیر بحث آتا ہے امیدوار کو مقالہ کا خلاصہ اور اس کی تیاری کے سلسلہ میں تمام ضروری اقدامات سب کے سامنے بیان کرنا ہوتے ہیں۔ مجلس ممتحنین امیدوار کی قابلیت کو کھلے طور پر جانچتی ہے۔

شعبۂ دینیات میں پہلے حصے یعنی Professional degree Course کا نصاب:

علم قرآن، علم حدیث، مسلم فرقوں کی تاریخ، فن تقریر و مباحثہ، تاریخ اسلام اور ان کے علاوہ ایک یوروپی اور ایک مشرقی زبان

شعبۂ دینیات میں دوسرے حصے یعنی Subjective degree Course کا نصاب:

علم وحدانیت کا تشریحی مطالعہ، منطق، فلسفہ اور اخلاقیات یا تفسیر میں سے کوئی ایک مضمون۔

شعبۂ قانونِ اسلامی میں پہلے حصے کا نصاب:

مسلم عدالتوں کے قانون اور اصولِ وقف اور وراثت کے قانون اور ان کے ساتھ بین الاقوامی قانون۔ ریاست کا ملکی قانون۔ اسلام کے منصف اور منصفی کے نظام۔ اصولِ معاشیات۔ علمِ طب اور علم نجوم کا خاکہ۔ اور انگریزی یا فرانسیسی میں سے اختیاری طور پر کوئی ایک زبان۔

شعبۂ قانون اسلامی میں دوسرے حصّہ کا نصاب :

مسلم قانون کا تجزیاتی مطالعہ۔ اور اس کے ساتھ مسلم قانون کا فلسفہ۔ اسلام کے نظامِ عدالت کی تاریخ۔

شعبۂ زبان عربی میں پہلے حصّہ کا نصاب :

عام نفسیات، تعلیمی نفسیات، اصول تعلیم، تاریخ تعلیم، مدرسہ کی تنظیم، تدریس کے طریقے، صحت و صفائی، ڈرائینگ، مضمون نگاری، جسمانی تعلیم اور اختیاری طور پر ایک غیر ملکی زبان۔

شعبۂ زبان عربی میں دوسرے حصّے کا نصاب :

قواعد، صوریات، علم صرف، علم اللسان، عروض، ابتدائی عبرانی اور شامی زبان، فن خطابت، عربی ادب، تاریخ عربی ادب اور عروض۔

۱۹۳۵ء کے قانون نمبر ۲۶ کے مطابق الازہر کا پرانا حصّہ جو مسجد میں ہے ان طلبا کے لئے حاصل کر لیا گیا تھا جو مذہب اور سائنس کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس حصّہ میں عمر، نصاب اور وقت کی کوئی قید نہ تھی۔ بہرحال آخر میں اہلیۃ الغرباء اور علمیات الغرباء کے نام سے دو امتحان رائج کئے گئے اور مدت تعلیم زیادہ سے زیادہ سات سال مقرر کی گئی۔ درحقیقت یہ حصّہ Extension lecture کے مقصد کو پورا کرتا تھا۔ سینکڑوں طلبا ان اسباق میں محض سامع کی حیثیت سے شریک ہوا کرتے تھے اور اس طرح یونیورسٹی کی تعلیم کا ایک حصّہ حاصل کر لیتے تھے۔

پچھلے ایک ہزار سال میں لکھی گئی الازہر کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تعلیمی ادارہ روحانی اور جسمانی دونوں مقاصد کے تحت قائم کیا گیا تھا اور یہی دونوں اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔ اسلام ریاست اور مذہب میں کسی حد فاصل کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ مذہب کو ریاست کی تکمیل کا ذریعہ بتاتا ہے۔ اسلام کے اسی نظریۂ زندگی کو سامنے رکھ کر الازہر کی تعلیم کا تعین کیا گیا۔ اگر الازہر کے نصاب تعلیم کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ماضی اور حال دونوں زمانوں میں اسکی تعلیم کا مقصد یہی رہا ہے کہ اچھے عالم، مفکر اور منتظم اور رہنما پیدا کئے جائیں۔ ابتدا ہی سے اور خاص طور پر امام عبدہٗ کی اصلاحات کے بعد سے الازہر کا پورا نظام ان چار اصولوں پر مبنی رہا ہے: تزکیۂ نفس، عمدہ سماجی زندگی، معاشی خود کفالتی، اور خدمت و ایثار۔

اگرچہ الازہر کے تمام نصاب ہائے تعلیم قرآن کی تعلیمات کی بنیاد پر تیار کئے گئے تھے۔ تاہم وہاں کا نظام تعلیم کبھی بھی مولوی پیدا کرنے کے مقصد پر مبنی نہیں رہا ہے۔ اسلام میں پاپائیت نہیں ہے، ہر فرد اپنے اعمال کا ذاتی طور سے ذمے دار سمجھا گیا ہے، اور محض کے

نزدیک خدا اور بندے کے درمیان کسی تیسرے شخص کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اجتماعی نقطۂ نظر سے بھی دیکھئے تو اسلام ایک سیکولر نظام کا حامی ہے۔ معلوم ہوتا ہے الازہر کی متعین پالیسی ہمیشہ یہی رہی ہے کہ اسلامی اصولوں کی اصل روح کی پیروی کی جائے۔ یہ ضرور ہے کہ حالات کی نامساعدت کی وجہ سے کبھی کبھی اس راستے سے اسے ہٹنا پڑا ہے۔ امام عبدہٗ سے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے دور تک الازہر نے اول درجے کے رہنما، منتظم اور مفکر مصر کو عطا کئے ہیں۔ اور جہاں تک مشرق قریب اور عرب ممالک کا تعلق ہے وہاں کے ملکی معاملات میں بھی بہت سے ازہر کے فارغ شدہ لوگ داخل رہے ہیں۔ گو یہ صورت حال اسی وقت تک تھی جب تک ان ممالک کو سامراجی ریشہ دوانیوں نے اپنے شکنجے میں نہیں لیا تھا۔ مشرق کی ایک جدید جمہوریہ انڈونیشیا کی حکومت اور پارلیمنٹ کے بہت سے ممبر الازہر ہی کے فارغ شدہ ہیں۔ ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین کے بانی اور علی گڑھ کالج کے معماروں میں سے ایک معمار مولانا شبلی نعمانی جامعہ ازہر ہی کے فارغ التحصیل[1] تھے۔ زندہ شخصیتوں میں ہندوستان میں مولانا ابوالکلام کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں[2]۔

چوں کہ اسلام کا بنیادی فلسفہ یہ رہا ہے کہ اچھے اور کارآمد شہری پیدا کئے جائیں اس لئے الازہر نے ہمیشہ اس بنیادی مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ ازہر کا طالب علم یا تو سیاست داں بن کر نکلتا ہے یا ماہر تعلیم۔ البتہ خود مصر میں یہ صورت حال نہیں ہے اس لئے کہ ازہری طلباء کی ایک بڑی تعداد کو حکومت کی ملازمتوں یا سفارتی کاموں پر مامور کیا جاتا ہے۔

جامعہ ازہر نے سائنٹفک تعلیم کے سلسلہ میں بھی کافی کام کیا ہے۔ ریاضی، علم طبیعات و کیمیا، اور علم نجوم کے سلسلہ میں، بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ اس یونیورسٹی سے نہ صرف مشرقی ممالک بلکہ یورپ کے مختلف ممالک کے بہت سے طالب علم بھی باقاعدہ طور سے مختلف شکلوں میں جامعہ ازہر کی کلاسوں میں بیٹھتے ہیں۔

جامعہ ازہر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے یونیورسٹی کے ماحول کے اعلیٰ ترین معیار کو ہمیشہ قائم رکھا ہے۔ یعنی مختلف مدرسہ ہائے خیال کو بیک وقت اور ہر زمانہ میں برداشت کیا ہے۔ شیخ المراغی نے مسلم فرقوں کے اتحاد کے پیش نظر "فرقوں کے اتحاد کی تحریک" کے نام سے ایک تحریک چلائی تھی جو دنیا بھر میں بہت پسند کی گئی۔

اسلامی دنیا کے مدبرین عموماً اور مصر کے خصوصاً الازہر کی مرکزیت اور نوعیت کے سلسلہ میں اس وقت

---

[1] یہ درست نہیں ہے (صحیح) [2] یہ بھی درست نہیں

دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین ایک گروہ کے رہنما ہیں جن کی مخلصانہ رائے یہ ہے کہ الازہر میں مختلف النوع نصابِ تعلیم کو رائج کر کے اس کے تاریخی کردار کو برقرار رکھنا چاہئے۔ اس طبقۂ فکر نے اصل میں اس خیال کی تائید کی ہے کہ الازہر عہدِ وسطیٰ میں ایک نمونہ کی یونیورسٹی تھی اور مغرب میں یونیورسٹی تعلیم کے پیشواؤں نے الازہر ہی کی نقل کی تھی۔ بلکہ یہ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ مغرب میں یونیورسٹی کا خیال ہی الازہر کو دیکھ کر پیدا ہوا۔ اس گروہ کی رائے یہ ہے کہ الازہر کو علم کی سچی لگن کے کلاسکی معیار کو قائم رکھنا چاہئے۔ اور یونیورسٹی کے جدید تصوّر سے دور رہنا چاہئے۔ اس لئے کہ آج تعلیم مختلف پیشوں Vocations میں مہارت کے حصول کی غرض سے لی جارہی ہے اور یونیورسٹیوں سے مختلف کام جاننے والے احمق پیدا ہو رہے ہیں۔

عبدالمطعال السعیدی جدید خیال رکھنے والے گروہ کے رہنما ہیں۔ ان لوگوں کا اصرار ہے کہ الازہر کو جدید یونیورسٹیوں کے نمونے پر ازسرِنو تشکیل دیا جائے تاکہ آج کے زمانے کے ساتھ قدم بہ قدم چلا جا سکے۔

موجودہ جامعہ ازہر کے معمار شیخ المراغی نے مختلف خصوصیتوں پر مبنی ایک بہت ہی عمدہ خاکہ تیار کیا۔ اور یونیورسٹی کو پختہ بنیادوں پر کھڑا کیا۔ شیخ نے عہدِ قدیم کی قابل قدر خوبیوں کو بھی برقرار رکھا اور جدید زمانے کی روح کو بھی سمویا۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۶ء تک ان کی تیار کی ہوئی اس اسکیم نے الازہر کی زندگی میں ایک معجزے کا کام کیا۔ اس عرصہ میں الازہر کا بنیادی مقصد پورا کرنے کے لئے مغرب و مشرق میں وفود بھی بھیجے گئے۔

آج کل الازہر کا انتظام ایک اعلیٰ مجلس انتظامیہ چلاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی علماء کی ایک مشاورتی کمیٹی بھی ہے اور ان دونوں مجالس کے صدر ریکٹر (شیخ الجامعہ) ہیں۔ اول الذکر مجلس میں ریکٹر، نائب ریکٹر، شعبوں کے صدر، مفتی اعظم، مالیات قانون اور وقف کے نائب معتمدین اور کچھ معزز شہری ہوتے ہیں۔ مشاورتی کمیٹی میں تیس ۳۰ اراکین ہوتے ہیں۔ ان میں عملے کے بڑے اور پرانے کارکن، دیوان الافتاء کے عملے کے سینیر ممبر، اور عدالت قانون ذاتی کے عملے کے سینیر ممبر شامل ہوتے ہیں۔

تصحیح بابت مضمون تصانیف اشعری - ۱- برہان بابت دسمبر ۵۶ء صہ ۳۶۲ سطر ۱ میں 'راجپوری' کے بجائے 'رامپوری' پڑھا جائے۔ ۲- برہان دسمبر ۵۶ء صہ ۳۶۶ سطر ۶ میں 'خوطی' کے بجائے 'فوطی' یعنی خ کے بجائے ف ہونا چاہیئے۔ ۳- برہان دسمبر ۵۶ء صہ ۳۷۴ سطر ۱ میں دو جگہ 'ارجان' ہے۔ دوسرے لفظ میں الف ہونا چاہیئے یعنی 'ارّاجان'۔ ۴- برہان جنوری ۵۷ء صہ ۵۲ سطر ۴ میں 'محمد بن عبد الضیمری' کی بجائے 'محمد بن عمر الصیمری' ہونا چاہیئے۔ اسی طرح سطر ۷ میں 'محمد بن عبد' کی جگہ 'محمد بن عمر' ہے

ادبیات

غزل

(جناب الم مظفرنگری)

ہر پردۂ مجاز کہ جلوا کہیں جسے — دھوکا ہے ایک وہم تماشا کہیں جسے
ہے ربطِ حسن و عشق کا در پردہ ایک راز — کہنے کو صرف جذبِ تمنا کہیں جسے
رکھتی ہے غرقِ مے کدہ دنیائے عشق کو — وہ اک ادا کہ جنبشِ مینا کہیں جسے
پروانے گردِ شمع لگن ڈھونڈتے رہے — اس سوزِ غم کو انجمن آرا کہیں جسے
لے آئیں مجھ کو آپ ہی طوفاں کی شورشیں — اس موج تک کہ ساحلِ دریا کہیں جسے
یوں تو ہیں اس میں پہلوئے تسکیں کئی مگر — ہے اک فریبِ وعدۂ فردا کہیں جسے
دل کو نہیں حقیقتِ دل کو بغور دیکھ — یہ ہی تو ہے وہ قطرہ کہ دریا کہیں جسے
اٹھتا ہے دشتِ نجد سے کیوں آج بار بار — ایسا غبار محملِ لیلا کہیں جسے
ہر برگِ گل پہ موجۂ شبنم ہے یوں عیاں — بہتی ہوئی سی مستیٔ صہبا کہیں جسے
دیکھے تو کوئی حاصلِ ناکامیٔ وفا — رشکِ چمن ہے داغِ تمنا کہیں جسے
دو گام بھی نہ خضر مرے ساتھ چل سکے — اس دشتِ بے پناہ میں دنیا کہیں جسے
وحشت نواز آنکھ نے دیکھا ہے بارہا — ذرے میں بھی ہے وسعتِ صحرا کہیں جسے

کیا مرتبہ ہے گنبدِ خضریٰ کا اے الم
پرتو ہے اس کا گنبدِ مینا کہیں جسے

غزل

(جناب شمس نوید)

فنا کے خوف میں ذوقِ ثبات بھی تو نہیں — حیات کیسی شعورِ حیات بھی تو نہیں
کمالِ فکر و نظر کائنات ساز بھی ہے — مآلِ فکر و نظر کائنات بھی تو نہیں!
شبِ سیاہ سے مفرور کارواں والو! — سحر کی عمر حسیں ایک رات بھی تو نہیں
ترے حصول کی حسرت جنوں سہی اے دوست — ترے بغیر سکونِ حیات بھی تو نہیں
مزاجِ حسن پہ الزام ہے تغافل کا — طلب میں خاص غمِ التفات بھی تو نہیں!

مرے فسانہ کی ٹوٹی ہوئی سی کڑیاں ہیں
کہ جن میں سلسلۂ واقعات بھی تو نہیں

"گزارشِ مجبور"

جناب فضاؔ ابن فیضی

گدازِ قلب دے، سوزِ جگر دے — مرا ساغر تہی ہے اس کو بھر دے
اُٹھا دے جہل و نادانی کے پردے — مذاقِ امتیازِ خیر و شر دے
الٰہی! نالہائے نیم شب میں — دعائے صبح گاہی کا اثر دے
اسے دے وسعتیں دونو جہاں کی — مرے سینے میں اپنا راز بھر دے
ترا فیضِ کرم اور شبنم آسا — میں قطرہ ہوں سمندر مجھ کو کر دے
خرد مجھ کو جنوں شیوہ عطا کر — جنوں مجھ کو خرد آشوب تر دے
ترے سرِّ نہاں کو فاش دیکھوں — وہ چشمِ نکتہ بیں و نکتہ ور دے
رہینِ کرّۂ خاکی کو اپنے — سرِ گردوں مجالِ رہ گزر دے
زیاں پرور ہے سودِ زندگانی — خیالِ سود و نقصاں محو کر دے
جگر کو مخزنِ سوزِ نفس کر — نظر کو جلوہ ہائے معتبر دے
مرا دل ہو چراغِ لالۂ طور — خودی کی آگ سے سینے کو بھر دے
جنوں کو جیب و پیراہن عطا کر — مری ویرانہ سامانی کو گھر دے
مراحل سب جہاں بینی کے طے ہوں — جو پہنچے لامکاں تک وہ نظر دے
یہ دنیا ہو چکی آئینہ مجھ پر — جہاں تو ہے وہاں کی اب خبر دے
مجھے رہنا ہے مثلِ بو پریشاں — چمن سے اب مجھے اذنِ سفر دے
یہی سامانِ جمعیّت ہے مجھ کو — مجھے مثلِ گریباں چاک کر دے
زمانے میں ہوں میں اک جنسِ نایاب — پھر اس نایاب کو تو عام کر دے

دعا یہ ہے کہ مثلِ نکہتِ گُل
مجھے اہلِ چمن پر فاش کر دے

تبصرے

ماتمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع ابن ماجہ

از مولانا عبدالرشید نعمانی تقطیع کلاں ضخامت ۵۶ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت درج نہیں پتہ :- اصح المطابع وکارخانہ تجارت کتب۔ آرام باغ۔ کراچی۔

یہ رسالہ عربی زبان میں ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں سنن ابن ماجہ جو حدیث کی مشہور کتاب ہے اُس سے متعلق مختلف مباحث مثلاً صاحبِ کتاب کا ترجمہ اور محدثین میں اُن کا مقام، محدثین کے نزدیک کتاب کی روایات کی حیثیت۔ کن کن محدثین نے کتاب کی کن روایات کو مجروح یا ضعیف قرار دیا ہے۔ کن حضرات نے اُس کی شرح یا اُس پر تعلیقات لکھی ہیں۔ اِن سب پر محققانہ کلام کیا گیا ہے۔ شروع میں حدیث سے متعلق مختلف مباحث۔ حجیتِ حدیث۔ قرونِ ثلاثہ میں حدیث کی کتابت اور تدوین۔ محدثین کے طبقات۔ ائمہ اربعہ اور اصحابِ صحاح کے شروطِ قبولِ روایت اُن پر بھی گفتگو کی ہے اور اس سلسلہ میں مفید اور ٹھوس معلومات جو علم حدیث کے طلبار اور اساتذہ کے لئے ضروری ہیں یکجا ہو گئی ہیں اس حیثیت سے یہ رسالہ قابلِ قدر اور لائقِ مطالعہ ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ فاضل مصنف نے جگہ جگہ امام ابوحنیفہ اور ان کے مخالفین کی بحث اٹھا کر کتاب کو جدل و مناظرہ کا رنگ دے کر اُس کی علمی حیثیت کو مجروح ہی نہیں کیا بلکہ خود حدیث کو معرضِ شک وارتیاب میں لا کھڑا کیا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض محدثین نے امامِ اعظم کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے لیکن اس کا جواب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ان محدثین پر اس طرح کے رکیک وسخیف حملے کئے جائیں جن سے اُن کا کمالِ فن ہی داغ دار ہو جائے اس سلسلہ میں امام بخاری۔ حافظ ابن حجر۔ اور حافظ ذہبی کی نسبت جو لب و لہجہ اختیار کیا گیا ہے وہ حد درجہ قابلِ اعتراض ہے۔ حد یہ ہے کہ امام بخاری کے متعلق یہاں تک نقل کر دیا گیا ہے کہ وہ بربنائے بغض وعناد امام ابوحنیفہ سے روایت نہیں کرتے لیکن اس کے برخلاف ایسے مستور الحال

لوگوں سے روایت کر دیتے ہیں جن کے متعلق بخاری جانتے بھی نہیں کہ کون تھے اور کون نہیں تھے (صفحہ ۲۸) اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ جوشِ انتقام میں صحیح بخاری کے راویوں کی عدالت اور اُس کے امت کی طرف سے تلقی بالقبول کو متکلم فیہ قرار دے دیا ہے۔ فاضل مصنف خود سوچیں کہ کیا یہ وہی باتیں نہیں ہیں جو منکرین حدیث کہتے ہیں اور کیا امام بخاری کی عدالت، ثقاہت، تقویٰ وطہارت اور اُن کی صحیح کی صحت کو مجروح کر دینے کے بعد بھی کسی اور کتابِ حدیث پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض متقدمین حنفیہ نے مجادلانہ طور پر امام بخاری، حافظ ابن حجر۔ ابن عدی۔ اور حافظ ذہبی وغیرہم کے متعلق اس طرح کی باتیں ضرور لکھی ہیں لیکن ایک محقق کا فرض ہے کہ علمی امانت و دیانت کا سر رشتہ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دے اور غیظ وغضب میں کوئی بات ایسی نہ کہے جس سے دین کی اصل بنیاد ہی میں رخنہ پڑ جائے۔ اگر امام بخاری بھی روایتِ حدیث ایسے اہم دینی معاملہ میں شخصی رضامندی یا نارضامندی کو دخل دینے سے محفوظ نہیں رہ سکتے تو پھر اس باب میں کسی اور پر کیونکر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ہاں امام اعظم پر بعض ظاہر پرستوں نے حدیث سے ناواقفیت کا جو الزام لگایا ہے اُس کے جواب میں لائق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اگرچہ اُس میں بھی غلو پایا جاتا ہے تاہم بڑی حد تک صحیح اور معلومات افزا ہے۔ بہر حال مجموعی حیثیت سے رسالہ علماء اور طلباء کے لئے مطالعہ کے لائق اور قابل قدر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے
مکتوبات ومعاہدات

شاہانِ عالم، عرب کے حکمرانوں اور قبائلی سرداروں کے نام دربارِ رسالت کی دینی تبلیغی سیاسی خط وکتابت اور معاہدات کو اُن کے پسِ منظر اور نتائج کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ دعوت وتبلیغ کی تاریخ مکتوباتِ نبوی کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔ ترجمہ نہایت سلیس وشگفتہ اور دل نشین ہے، اصل مکتوباتِ نبوی کے تین فوٹو بھی کتاب میں شامل ہیں۔ مرتبہ سید محبوب رضوی صاحب، قیمت عہ۔ علمی کتاب خانہ جامع مسجد دہلی

ندوۃ المصنفین کی تاریخی کتابیں

غُلامانِ اسلام

اسّی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور کارناموں کا ایمان افروز بیان۔
قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔ مجلد چھ روپے آٹھ آنے۔

تاریخِ اسلام پر ایک نظر

تاریخ اسلام کے تمام ادوار کے ضروری حالات و واقعات کی تفصیل تاریخ نویسی کے جدید تقاضوں کو سامنے رکھ کر، اسلوبِ بیان نہایت ہی دل نشین۔
قیمت چھ روپے۔
مجلد چھ روپے آٹھ آنے۔

مُسلمانوں کا نظم مملکت

مسلمانوں کے نظامِ حکمرانی کی بصیرت افروز تاریخ، جس میں مسلمانوں کے آئینِ جہانبانی کے تمام شعبوں سے متعلق نہایت صاف اور روشن معلومات دی گئی ہیں۔
قیمت چار روپے۔ مجلد پانچ روپے۔

تاریخ مشائخ چشت

سلسلۂ چشت کے صوفیائے کرام کی محققانہ تاریخ اور ان کے نظامِ اصلاح و تربیت کا مکمل تذکرہ، لائق مطالعہ کتاب۔
قیمت بارہ روپے۔ مجلد تیرہ روپے۔

تاریخ اسلام نو جلدوں میں

تھوڑے وقت میں تاریخ اسلام پڑھنے والوں کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ تاریخ ملت کے یہ تمام حصے مستند و معتبر بھی ہیں اور جامع و مکمل بھی، طرزِ بیان نہایت شگفتہ و رواں، ترتیب دل نشین۔

نبی عربی صلعم قیمت بلا جلد ۱۲؍
خلافت راشدہ 〃 ۱۲؍
خلافت بنی امیہ 〃 ۱۲؍
خلافت ہسپانیہ 〃 ۱۲؍
خلافت عباسیہ اوّل بلا جلد ۱۲؍
خلافت عباسیہ دوم 〃 ۱۲؍
تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ 〃 ۱۴؍
خلافت عثمانیہ 〃 ۱۴؍
تاریخ صقلیہ بلا جلد قیمت ۶؍
قیمت مکمل سیٹ غیر مجلد ۲۵؍
مجلد ۲۷؍

عرب اور اسلام

ڈاکٹر حتی کی مشہور و معروف کتاب کا آسان اور نفیس ترجمہ۔
قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ مجلد چار روپے آٹھ آنے۔

حُکمائے اسلام کے شاندار کارنامے

قرونِ وسطیٰ کے حکمائے اسلام، سائنس دانوں اور فلاسفروں کے بے مثال علمی کارناموں کا بیان۔ قیمت جلد اول مجلد ۱۲؍
قیمت جلد دوم مجلد ۸؍
مکمل سیٹ مجلد ۱۴؍

مُسلمانوں کا عروج اور زوال

جدید ایڈیشن (اپنے موضوع پر ایک اچھوتی کتاب) جس میں خلافت راشدہ کے دور سے لے کر ہندوستان کے عہدِ حکمرانی تک مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب کا محققانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔
قیمت چار روپے۔ مجلد پانچ روپے۔

حیات شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

شیخِ محدث کے کمالات و فضائل کا صاف و شفاف نقشہ اور اس دور کی بصیرت افروز تاریخ۔ قیمت ۶؍ مجلد ۷؍

منیجر ندوۃ المصنفین اُردو بازار جامع مسجد دہلی

Registerd No. D. 183

ندوۃ المصنفین کی ممبر شپ

۱۔ لائف ممبر کم سے کم ایک ہزار روپے یک مشت مرحمت فرمانے والے اصحاب اس حلقے میں شامل کئے جاتے ہیں، ایسے اربابِ ذوق کی خدمت میں برہان اور مکتبہ برہان اور ادارے کی تمام مطبوعات پیش کی جاتی ہیں، کتابوں کی جلد پر لائف ممبر کا نام نامی سنہری حرفوں سے ثبت کیا جاتا ہے۔

۲۔ معاونین خاص کم سے کم سو روپے سالانہ مرحمت فرمانے والے اصحاب حلقۂ معاونینِ خاص میں داخل کئے جاتے ہیں اور ان کی یہ اعانت عطیۂ خالص کے طور پر قبول کی جاتی ہے، ان حضرات کی خدمت میں بھی سال کی تمام مطبوعات اور برہان بغیر کسی معاوضے کے پیش کیا جاتا ہے۔

۳۔ معاونین اس حلقے کی سالانہ فیس تیس روپے ہے، معاونین کی خدمت میں سال بھر کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور برہان کسی مزید معاوضے کے بغیر پیش کئے جاتے ہیں۔

۴۔ معاونینِ عام معاونینِ عام کی سالانہ فیس بیس روپے ہے، ان کو سال کی تمام غیر مجلد مطبوعات دی جاتی ہیں اور برہان بلا قیمت دیا جاتا ہے۔

۵۔ احبا حلقۂ احباء کی سالانہ فیس دس روپے ہے، ان کی خدمت میں برہان بلا قیمت پیش کیا جاتا ہے اور ان کی طلب پر ایک فیس کے بدلے میں ایک سال کی غیر مجلد مطبوعاتِ ادارہ نصف قیمت پر دی جاتی ہیں۔

قواعدِ رسالہ برہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیج دیا جائے گا اس کے بعد شکایت قابلِ اعتبار نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہئے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ دوسرے ملکوں سے گیارہ شلنگ (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ آنے۔

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے الجمعیۃ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان دہلی سے شائع کیا۔